عقائد و اعمال اور اخلاق اصلاح کیلئے
منتخب حدیثیں
حضرت علامہ شیخ الحدیث مولانا عبد المصطفیٰ الاعظمی صاحب مجددی

مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ○

جو رسول کی اطاعت کرے تو یقیناً اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔

نوادرُ الحدیث

چالیس حدیثوں کا ترجمہ اور شرح

المعروف

منتخب حدیثیں

مؤلفہ

حضرت علامہ شیخ الحدیث مولانا عبد المصطفےٰ اعظمی صاحب مجددی مدظلہ

رومی پبلیکیشنز اینڈ پرنٹرز لاہور (پاکستان)

نام کتاب ——— منتخب حدیثیں

مصنف ——— حضرت علامہ شیخ الحدیث
مولانا مصطفےٰ صاحب مجدّدی مدظلّہ

مطبوعہ ——— جنرل پرنٹرز ۲۲/۱ ریٹیگن روڈ ہجویری پارک لاہور

ناشر ——— رومی پبلیکیشنز پرنٹرز لاہور

کتابت ——— طالب حسین

قیمت ——— ۱۸/ روپے
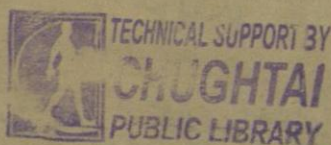
ملنے کا پتہ

فرید بک سٹال ۴۰ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
احادیث دل	۹	فقط نیت پر ثواب	۳۳
حدیث کی چند اصطلاحیں	۱۴	فوائد و مسائل	۳۴
دین میں حدیث کا مقام	۱۶	**ارکانِ اسلام** (۲)	۳۸
منصبِ رسالت	۱۷	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ	۳۹
منکرین حدیث کی نفسانیت	۱۷	اس حدیث کی شان	۴۰
لطیفہ	۱۸	توضیح الفاظ	۴۱
نیّت کا پھل (۱)	۲۰	عبادت	۴۱
حضرت عمر رضی اللہ عنہ	۲۰	تعظیم و عبادت میں فرق	۴۱
اس حدیث کی خصوصیات	۲۱	شرک	۴۲
توضیح الفاظ	۲۳	شرح حدیث	۴۲
نیّت	۲۳	ایمان	۴۴
ہجرت	۲۳	اللہ پر ایمان	۴۴
دُنیا	۲۵	فرشتوں پر ایمان	۴۴
ارشادِ حدیث کا باعث	۲۵	لقائے الٰہی پر ایمان	۴۵
شرحِ حدیث	۲۶	رسولوں پر ایمان	۴۵
حکایت	۲۷	اسلام کے معنی	۴۵
	۲۹	کلمۂ شہادت	۴۶
ایک عمل چند نیت	۳۰	نماز	۴۶
بُری نیّت کا انجام	۳۱	زکوٰۃ و روزہ	۴۷
اچھی نیّت کا ثمرہ	۳۲	حج	۴۷

عنوان	صفحہ
احسان کی حقیقت	۴۷
قیامت کی نشانیاں	۴۸
قیامت کا علم	۴۹
خلاصۂ کلام	۵۳
مسائل حدیث	۵۳
درختِ ایمان کی شاخیں (۳)	۵۵
توضیح الفاظ	۵۵
شرح حدیث	۵۶
حیا بڑی شاخ کیوں ہے؟	۵۷
ساٹھ یا ستر؟	۵۸
فوائد و مسائل	۵۹
کون مسلمان افضل ہے؟ (۴)	۶۰
حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ	۶۰
شرح حدیث	۶۱
فوائد و مسائل	۶۱
مومن کامل (۵)	۶۴
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ	۶۴
شرح حدیث	۶۵
فوائد و مسائل	۶۶

عنوان	صفحہ
ایک ضروری انتباہ	۶۶
علاماتِ نفاق (۶)	۶۹
حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ	۶۹
شرح حدیث	۷۰
فوائد و مسائل	۷۱
امانت میں خیانت	۷۲
جھوٹ	۷۳
عہد شکنی	۷۴
گالی	۷۴
مشتبہ چیزوں سے بچو (۷)	۷۶
حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ	۷۷
شرح حدیث	۷۷
فوائد و مسائل	۷۹
عُلماءِ دین (۸)	۸۱
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ	۸۱
شرح حدیث	۸۲
فوائد و مسائل	۸۲
فقہ	۸۲
حدیث گھڑنے والا جہنمی ہے (۹)	۸۶
ربعی بن حراش	۸۶
حضرت علی رضی اللہ عنہ	۸۷

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
شرح حدیث	۸۷	رسول کی بیعت (۱۲)	۱۰۵
فوائد و مسائل	۸۸	حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ	۱۰۶
عذاب قبر (۱۰)	۹۲	توضیح الفاظ	۱۰۶
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ	۹۲	بدر	۱۰۶
شرح حدیث	۹۳	نقباء	۱۰۷
گناہ کبیرہ کون کون ہیں؟	۹۳	لیلۃ العقبہ	۱۰۷
گناہ کبیرہ کس کو کہتے ہیں؟	۹۵	شرح حدیث	۱۰۸
چغلی کیا ہے	۹۵	پیری مریدی	۱۰۸
دوسری نجاستوں اور گناہوں سے بھی بچو	۹۵	دُنیا میں لباس آخرت میں ننگی (۱۳)	۱۱۰
عالمِ برزخ کا علم	۹۶	حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا	۱۱۰
قبر پر پھول	۹۷	فوائد حدیث	۱۱۱
قبر کے پاس تلاوت	۹۷	مسائل حدیث	۱۱۲
ایصال ثواب	۹۷	خونِ ناحق (۱۴)	۱۱۳
سوال و جواب	۹۸	حضرت جریر رضی اللہ عنہ	۱۱۳
ایمان کی مٹھاس (۱۱)	۹۹	حجۃ الوداع	۱۱۳
شرح حدیث	۹۹	شرح حدیث	۱۱۴
اللہ و رسول سے محبت	۱۰۰	فوائد و مسائل	۱۱۴
حُبّ فی اللہ	〃	کُتّے کو پانی پلانے والا (۱۵)	۱۱۵
حکایت	۱۰۱	فوائد و مسائل	۱۱۵
کُفر آگ میں جانے کے برابر	۱۰۳		
فوائد و مسائل	۱۰۴		

عنوان	صفحہ
بلی کو بھوک سے مارنیوالی (۱۶)	۱۱۸
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ	۱۱۸
فوائد و مسائل	۱۱۹
وعظ کیلئے دن مقرر کرنا (۱۷)	۱۲۱
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	۱۲۱
فوائد و مسائل	۱۲۲
فتنوں کا سیلاب (۱۸)	۱۲۵
حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ	۱۲۵
توضیح الفاظ	۱۲۶
شرح حدیث	۱۲۶
فوائد و مسائل	۱۲۷
گوشہ نشینی	۱۲۸
آقا اور غلام ایک لباس میں (۱۹)	۱۳۰
حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ	۱۳۱
ربذہ	۱۳۱
شرح حدیث	۱۳۱
حضرت ابوذر کا ایک شاہکار	۱۳۲
مسائل حدیث	۱۳۳
زمین کی پیٹھ بہتر یا پیٹ؟ (۲۰)	۱۳۵
شرح حدیث	۱۳۵
پانچ گناہ، پانچ عذاب (۲۱)	۱۳۸
شرح حدیث	۱۳۸
نبی کا علم ماکان و مایکون (۲۲)	۱۴۱
حضرت عمرو بن اخطب رضی اللہ عنہ	۱۴۱
شرح حدیث	۱۴۲
مسائل حدیث	۱۴۲
نعت خوانی کا اہتمام (۲۳)	۱۴۴
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ	۱۴۴
حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ	۱۴۵
فوائد و مسائل	۱۴۶
دُنیا نگاہِ نبوت میں (۲۴)	۱۴۷
فوائد و مسائل	۱۴۷
جنت کی گارنٹی (۲۵)	۱۵۱
فوائد و مسائل	۱۵۱
لطیفہ	۱۵۳

عنوان	صفحہ
راستوں کا حق (۲۶)	۱۵۵
فوائد و مسائل	۱۵۵
جنّت کا باغ (۲۷)	۱۵۸
فوائد و مسائل	۱۵۸
وسیلہ (۲۸)	۱۶۱
فوائد و مسائل	۱۶۱
تبرکاتِ نبوّت (۲۹)	۱۶۴
حضرت ابوبُردہ رضی اللہ عنہ	۱۶۴
حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ	۱۶۵
فوائد و مسائل	"
تبرکاتِ نبوّت کی تعظیم	"
موئے مبارک کی زیارت	۱۶۷
لطیفہ	۱۶۷
تصویریں (۳۰)	۱۷۱
حضرت سعید بن ابی الحسن رضی اللہ عنہ	۱۷۲
شرحِ حدیث	۱۷۲
فوائد و مسائل	۱۷۲
زمین کے خزانے (۳۱)	۱۷۴
حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ	۱۷۴
فوائد و مسائل	۱۷۵
زیارتِ قبور	۱۷۵
علماء کی دست بوسی (۳۲)	۱۸۰
حضرت زارع رضی اللہ عنہ	۱۸۰
فوائد و مسائل	۱۸۰
تین منجیات، تین مہلکات (۳۳)	۱۸۲
فوائد و مسائل	۱۸۲
تقویٰ	۱۸۳
حق بولنا	۱۸۳
درمیانی چال	۱۸۳
خواہشِ نفس کی پیروی	۱۸۳
بخیلی کی اطاعت	۱۸۳
اپنی ذات پر گھمنڈ	۱۸۴
غیبت زنا سے بدتر (۳۴)	۱۸۵
حضرت جابر رضی اللہ عنہ	۱۸۵
فوائد و مسائل	۱۸۶
غیبت کیا ہے؟	۱۸۶
کن کن لوگوں کی غیبت جائز ہے؟	۱۸۷

عنوان	صفحہ
پہلوان کون ہے؟ (۳۵)	۱۸۸
شرح حدیث	۱۸۸
جسمانی و روحانی طاقت	۱۸۹
غصہ	۱۸۹
ایک مثال	۱۹۰
درازیِ عمر کا نسخہ (۳۶)	۱۹۲
فوائد و مسائل	۱۹۲
ایک سوال و جواب	۱۹۳
قبر میں ثواب (۳۷)	۱۹۵
شرح حدیث	۱۹۵
بیٹیاں (۳۸)	۱۹۷
فوائد و مسائل	۱۹۷
خیر خواہی (۳۹)	۲۰۰
شرح حدیث	۲۰۱
حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ	۲۰۲
فوائد و مسائل	۲۰۲
بول میں ہلکے، تول میں بھاری (۴۰)	۲۰۴
فوائد و مسائل	۲۰۴
چند محدثین کا تعارف	۲۰۷
دعاء	۲۱۴
قطعاتِ تاریخ	۲۱۶

احادیثِ دل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ سَرْمَدًا ۝ صَلِّ عَلٰى حَبِيْبِكَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَبَدًا ۝

نہ شبم، نہ شب پرستم، کہ حدیثِ خواب گویم
چوں غلامِ آفتابم ہمہ از آفتاب گویم

آفتاب رسالت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بہت ہی "بشارت آمیز" حدیث ہے کہ:

مَنْ حَفِظَ عَلٰى اُمَّتِىْ اَرْبَعِيْنَ حَدِيْثًا فِىْ اَمْرِ دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِيْهًا وَّكُنْتُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَّشَهِيْدًا ۝ (مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۳۶)

ترجمہ: "جو شخص دینی معاملات کے متعلق چالیس حدیثیں یاد کر کے میری اُمت تک پہنچادے گا اللہ تعالیٰ اس کو (قیامت کے دن) اس شان کے ساتھ اُٹھائے گا کہ وہ "فقیہ" ہوگا اور میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور اُس کے لیے گواہی دوں گا۔"

جب سے اس حدیث کے مطالعہ سے نظر سرفراز ہوئی۔ برابر دل میں یہ تڑپ اور قلب کی گہرائیوں میں یہ جذبہ موجزن رہا کہ کیوں نہ میں بھی دوسرے محدثین کرام

کی طرح چالیس حدیثوں کا ایک مجموعہ لکھ دوں اور اُمتِ رسول کی بارگاہ میں پیش کر کے اس "بشارتِ عظمیٰ" کے امیدواروں کی مقدس فہرست میں اپنا نام بھی درج کرا لوں۔ شاید کہ میرا رب کریم اپنے فضل وکرم سے مجھ بے علم و بے عمل اور گناہگار انسان کو بھی اس مایۂ ناز، سعادت کے اعزاز سے سرفراز فرما دے!

چنانچہ اسی تمنّا میں یہ چالیس حدیثوں کا ایک گلدستہ ترجمہ اور شرح کے ساتھ لکھ کر "نوادر الحدیث" کے نام سے اُمتِ رسولؐ کی خدمت میں نذر کرتا ہوں اور خداوندِ رحمٰن و رحیم کی رحمت اور اس کے فضلِ عظیم سے امیدوار ہوں کہ وہ میری اس حقیر خدمت کو قبول فرما کر قیامت کے دن "فقہائے کرام" کی صفِ نعال میں مجھ کو جگہ عطا فرما دے۔ اور رسولِ رحمت کی شفاعت کی کملی میں میرے جرموں کی پردہ پوشی فرما دے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ وهو حسبی و نعم الوکیل ۔

اس کی قدرت ہے کہ اک ذرّے کو صحرا کر دے
وہ اگر چاہے تو اِک قطرہ کو دریا کر دے
ایک "کُن" کہہ کے وہ کونین کو پیدا کر دے
اپنے الطافِ کریمانہ سے وہ چاہے اگر

۲

میں نے یہ کتاب خاص طور پر مبتدی طلبہ، نئے مقررین اور اُردو خواں عوام کے مطالعہ کے لیے تحریر کی ہے۔ اس کتاب میں قصداً میں نے حدیثوں کی سندوں پر محدثانہ کلام نیز مسائل پر فقیہانہ بحثوں اور صرف و نحو، یا علم معانی و بیان کے علمی نکات کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے اور شوکتِ الفاظ، جدتِ تراکیب، عبارت آرائی وغیرہ کے تکلفات سے بھی عمداً اجتناب کیا ہے اور نہایت ہی سادہ اور سلیس زبان اور بالکل ہی عام فہم عبارت میں اپنے مفہوم کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا ناقدینِ فن اور علمی نکات کے متلاشی احباب سے دست بستہ ملتجی ہوں کہ وہ اس مجموعہ میں مذکورہ بالا محاسن کو نہ تلاش کریں اور یہ سمجھ کر اس مجموعہ کو شرفِ قبول سے سرفراز فرمائیں کہ ؎

گل آورد سعدی سوئے بُوستاں
بشوخی، چو فلفل بہ ہندوستاں

٣

میں نے بالقصد اس کتاب میں نہ باب اور فصل کی قید رکھی۔ نہ مضامین کی ترتیب کا کوئی خاص اہتمام کیا۔ بلکہ مختلف مضامین کی حدیثوں کو یکے بعد دیگرے کسی خاص ترتیب کے تحریر کرتا چلا گیا۔ کیونکہ میرا تجربہ ہے کہ ایک ہی قسم کے مضامین کو لگاتار پڑھتے رہنے سے عموماً مطالعہ کرنے والے اُکتا جاتے ہیں اور تازہ بہ تازہ، نوع بنوع مختلف قسم کے نئے نئے مضامین کو عجیب عجیب عنوانوں کے ساتھ پڑھنے سے طبیعت کی تازگی اور ذوق کا نشاط برابر بڑھتا رہتا ہے۔ خدا کرے کہ میری یہ غیر معروف اور بے ڈھنگی روش ناظرین کرام کو بھی پسند آجائے۔

٤

میں اُن تمام ناظرین کرام کا انتہائی ممنون اور شکر گزار ہوں گا۔ جو اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اخلاص قلب کے ساتھ میرے حق میں یہ دُعا فرمائیں گے کہ خداوند کریم اپنے فضل و کرم سے میری اس حقیر قلمی خدمت کو دونوں جہانوں میں مقبولیت کی کرامتوں سے سرفراز فرمائے اور میرے لیے اور میرے والدین کے لیے اس کو توشۂ آخرت، اور سامان مغفرت بنائے ؎

نذرِ من، در دو جہاں، با عزت و تمکین باد
ایں دُعا از من و از جملہ جہاں "آمین" باد

٥

لکھ چکا وعظ بھی، حکایت بھی — تھیں یہ میرے نصیب کی باتیں
اب مدینہ کی یاد آئی ہے — لکھ رہا ہوں حبیبؐ کی باتیں

گلشن قدس کی بہاروں میں | باغ جنت کے پھول لایا ہوں
عاشقو! بھر لو دامنِ دل کو | یعنی حدیثِ رسول" لایا ہوں

عمر گزری ہے لکھنے پڑھنے میں | سب کتابوں سے ہو چکا دل سیر
اب لگن ہے حدیث و قرآں سے | اس کو کہتے ہیں "خاتمہ بالخیر"

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ اشرف الانبیاء وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

عبد المصطفیٰ الاعظمی عفی عنہ
۲۷، رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ
محلہ کریم الدین پور۔ پوسٹ گھوسی
ضلع اعظم گڑھ

انتساب
و
ایصال ثواب

میں اپنی اس کتاب کے ذریعے ان تمام علماء

دین اور فقہاء و محدثین کی ارواحِ طیبہ کو ایصال ثواب

کرتا ہوں، جن کے نوکِ قلم کی سیاہی شہیدوں

کے خُون کا درجہ رکھتی ہے!

ناظرین کرام بھی فاتحہ پڑھ کر اس کتاب کا مطالعہ کریں

انشاء اللہ تعالیٰ خیر و برکت پائیں گے۔

خاکپائے علماء کرام

عبدالمصطفیٰ الاعظمی

عفی عنہ

حدیث کی چند اصطلاحیں

حدیث حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، یا صحابہ تابعین نے جو کچھ فرمایا، اور جو کچھ کیا یا کسی کو کچھ کہتے سُنا یا کچھ کرتے دیکھا اور اس پر منع و انکار نہیں فرمایا - بلکہ خاموش رہے تو ان سب چیزوں کو محدثین کی اصلاح میں "حدیث" کہا جاتا ہے!

اس اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں ہوگئیں۔

(۱) حدیث مرفوع (۲) حدیث موقوف (۳) حدیث مقطوع۔

حدیث مرفوع وہ حدیث جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے یعنی اُس حدیث میں یہ ذکر کیا گیا ہو کہ حضور نے ایسا فرمایا۔ یا حضور نے ایسا کیا یا حضور کے سامنے لوگوں نے ایسا کہا یا ایسا کیا اُس کو "حدیث مرفوع" کہتے ہیں!

حدیث موقوف وہ حدیث جو صحابی تک پہنچے۔ یعنی اس حدیث میں یہ مذکور ہو کہ مثلاً ابن عباس نے کہا۔ یا ابن عمر نے کیا۔ یا ابن مسعود نے ایسا دیکھا یا سُنا تو اس کو "حدیث موقوف" کہتے ہیں۔

حدیث مقطوع وہ حدیث جو تابعی تک پہنچے۔ یعنی اُس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہو کہ مثلاً سعید بن جُبیر نے ایسا کہا یا ایسا کیا یا عکرمہ نے لوگوں کو یہ کرتے دیکھا۔ یا یہ کہتے سُنا۔ تو اس کو "حدیثِ مقطوع" کہتے ہیں۔

روایت حدیث نقل کرنا۔ حدیث بیان کرنا۔

راوی حدیث نقل کرنے والا۔ حدیث کو بیان کرنے والا۔

سندِ حدیث حدیث کو نقل کرنے والے راویوں کا سلسلہ جیسے عن ابن شهاب عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

متنِ حدیث جہاں سند ختم ہو جائے اس کے بعد کے الفاظ کو "متنِ حدیث" کہا جاتا ہے۔

صحابی جس کو بحالتِ ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی اور ایمان ہی پر اس کا خاتمہ ہوا۔

تابعی جس نے بحالتِ ایمان کسی صحابی سے ملاقات کی اور ایمان ہی پر اس کا خاتمہ ہوا۔

اس اعتبار سے کہ اصل حدیث راوی تک کس طرح پہنچی ؟ حدیث کی چار قسمیں ہیں (۱) حدیث متواتر (۲) حدیث مشہور (۳) حدیث عزیز (۴) حدیث غریب۔

حدیث متواتر وہ حدیث ہے جس کے روایت کرنے والے ہر زمانے میں اس قدر کثیر لوگ ہوں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہو جانا عادتاً محال ہو۔

حدیث مشہور وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر دور میں دو سے زیادہ رہے ہوں اس کو "حدیث مستفیض" بھی کہتے ہیں۔

حدیث عزیز وہ حدیث ہے جس کو ہر دور میں دو راوی روایت کرتے رہے ہوں اور پوری سند میں کہیں بھی دو راوی سے کم نہ ہوں۔

حدیث غریب وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ سند میں کہیں صرف ایک ہی راوی رہ گیا ہو۔

وضاع الحدیث جھوٹی حدیثیں گھڑ لینے والا۔ ایسا آدمی سخت گنہگار اور جہنمی ہے۔

حدیث موضوع جھوٹے راوی کی بیان کی ہوئی حدیث جس کا حدیثِ رسول ہونا ثابت نہ ہو یہ "حدیثِ موضوع" ہے جو قطعاً غیر معتبر ہے۔

مُحدِّثین علومِ حدیث میں مشغول ہونے والے حضرات "محدثین" کہلاتے ہیں۔

مؤرخین گزرے ہوئے زمانے کی تواریخ اور حالات بیان کرنے والے "مورخین" یا "اخباری" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

صحاحِ ستّہ (۱) بخاری شریف (۲) مسلم شریف (۳) ترمذی شریف (۴) ابوداؤد شریف (۵) نسائی شریف (۶) ابن ماجہ شریف

حدیث کی یہ چھ مشہور کتابیں "صحاح ستہ" کہلاتی ہیں۔

دین میں حدیث کا مقام

زمانۂ نبوّت سے آج تک تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ رہا ہے کہ احکامِ شریعت کی دلیلوں میں سے سب سے مُقدّم اور سب سے اعلیٰ خُدا کی مقدس کتاب "قرآن مجید" ہے اور چونکہ قرآن ہی کی تصریحات وہدایات کے بموجب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واطاعت بھی ہر مسلمان کے لیے لازمُ الایمان، اور واجب العمل ہے۔ کیوں کہ بغیر اس کے قرآن مجید کی آیتوں کے صحیح مفہوم، اور حقیقی مُراد کو سمجھ لینا غیر ممکن اور محال ہے۔ اس لیے قرآن مجید کے بعد احکام شریعت کی دلیل بننے میں حدیث ہی کا درجہ ہے۔ اس کے بعد اجماعِ امت اور قیاسِ مجتہد کا درجہ ہے اس لیے یہ عقیدہ رکھنا ضروریاتِ دین میں سے ہے کہ قرآن مجید وحدیث دونوں ہی دینِ اسلام کی مرکزی بنیاد اور احکام شرع کی مضبوط دلیلیں ہیں۔

اس دَور کے بعض مُلحدین جو اپنے آپ کو "اہل قرآن" کہتے ہیں اور حدیثوں کے دلیل شرعی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے صاف اور صریح لفظوں میں ان ظالموں کے اس کافرانہ نظریہ کا رد فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ

مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (حشر)

یعنی رسول جو کچھ تم کو حُکم دیں اس کو لو اور جس چیز سے تم کو منع کریں اُس سے باز رہو۔

مسلمانو! دیکھ لو۔ قرآن کا یہ فرمان صاف صاف اعلان کر رہا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی، جو حدیثوں کی صورت میں ہیں یقیناً بلا شُبہ واجب العمل اور احکام شرع کی حُجت اور مضبوط دلیلیں ہیں۔

منصبِ رسالت

حقیقت تو یہ ہے کہ جو لوگ حدیثوں کے دلیل شرعی ہونے کا انکار کرتے ہیں وہ حقیقت مقامِ نبوت و منصبِ رسالت ہی کے منکر ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک رسول کی حیثیت محض ایک "قاصد اور ایلچی کی سی ہے، حالانکہ قرآن مجید نے صاف و صریح لفظوں میں اس مُلحدانہ نظریہ اور کافرانہ ہوا اس کی جڑ ہی کاٹ ڈالی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج (نسا) یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ کہیں ارشاد فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (نسا) یعنی ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے بھیجا تاکہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کریں۔ اسی طرح ارشاد ربانی ہے کہ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف) یعنی رسول لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے منع کرتے ہیں اور لوگوں کے لیے ستھری چیزوں کو حلال فرماتے ہیں اور گندی چیزوں کو حرام فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات اور اُس قسم کی دوسری بہت سی آیتیں اعلان کر رہی ہیں کہ رسول ایک "قاصد اور ایلچی" کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ بلکہ رسول کا منصبِ رسالت اس قدر بلند و بالا ہے کہ رسول مقتدیٰ اور مُطاع ہیں۔ رسول آمر و ناہی ہیں۔ رسول حلال کرنے والے، حرام کرنے والے ہیں۔ رسول حاکم و حکم، اور مُعلّم و شارع ہیں۔

مسلمانو! ذرا سوچو تو سہی؟ کہیں قاصد اور ایلچی کی بھلا یہ شان ہوا کرتی ہے؟

مُنکرینِ حدیث کی نفسانیت

پھر یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ منکرینِ حدیث نے کسی دینی جذبہ کے ماتحت قرآن پر عمل اور حدیثوں کے انکار کا اعلان نہیں کیا ہے بلکہ اس فتنہ و فساد سے ان کی غرض فاسد یہ ہے کہ حدیثوں کا انکار کر کے قرآن کے معانی و مطالب بیان کرنے میں وہ تشریحاتِ نبوت

کی مقدس حد بندیوں سے آزاد ہو جائیں اور بالکل آوارہ ہو کر قرآن کے مفہوم و مراد کو اپنی نفسانی خواہشوں کے مطابق ڈھال سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بہت ہی دلچسپ بھی ہے اور نہایت ہی عبرت خیز و نصیحت آموز بھی۔

لطیفہ ایک منکرِ حدیث خواہ مخواہ مجھ سے اُلجھ گیا اور کہنے لگا کہ قرآن میں "اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ" کے معنی مولویوں نے جو "نماز پڑھنا" بتایا ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ لغت میں "صلوٰۃ" کے معنی تو دُعا مانگنے کے ہیں۔ لہٰذا اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ کا یہ مطلب ہوا کہ پابندی کے ساتھ دُعا مانگتے رہو۔"

میں نے اس سے کہا کہ الفاظِ قرآن کے معانی لغت سے بیان کیے جائیں گے؟ ورنہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریحات کے مطابق قرآن کا ترجمہ کیا جائے گا؟ تو اُس نے نہایت بے باکی کے ساتھ برجستہ کہا کہ جناب! قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ لہٰذا عربی کی لُغات ہی سے قرآن کا ترجمہ کیا جائے گا۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریحات کا پابند ہونا ہمارے لیے کوئی ضروری نہیں ہے۔

یہ سُن کر میرا خون کھول گیا۔ مگر میں نے ضبط کیا۔ لیکن جل بُھن کر میں نے اُس سے کہا کہ جناب! اگر لغت ہی سے قرآن کا ترجمہ کرنا ہے تو لغت میں "صلوٰۃ" کے بہت معنی لکھے ہُوئے ہیں اور ایک بہت ہی دلچسپ مگر بھونڈے معنی "تحریک الصلوین" (سُرین ہلانا) بھی ہے (تفسیر بیضاوی) تو پھر "اقیموا الصلوٰۃ" کا یہ ترجمہ کیوں نہ کیجئے؟ کہ "پابندی سے سُرین ہلاتے رہو" چلو چھٹی ہوئی۔ نہ نماز پڑھنے کی ضرورت نہ دُعا مانگنے کی حاجت۔ بس ہر دَم سُرین ہلاتے رہو اور قرآن پر عمل کرتے رہو۔

میری یہ غضبناک مگر حقیقت افروز تقریر سُن کر وہ اس قدر مرعوب ہوا اور جھینپ گیا کہ پھر نہ وہ مجھ سے آنکھ ملا سکا۔ نہ کچھ بول سکا بلکہ دُم دبا کر چپکے سے بھاگ نکلا۔

بہر حال حقیقت تو یہ ہے کہ دین میں احادیث رسول کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ بغیر احادیث کے تو قرآن مجید کا کلامِ الٰہی ہونا بھی نہیں معلوم ہو سکتا۔ اگر رسولِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما دیتے کہ "الحمد" سے "والناس" تک کا پورا کلام "قرآن مجید" اور کلام الٰہی ہے تو قیامت تک کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ کون "کلام اللہ" اور کون "کلامِ رسول" ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان کو اس حقیقت پر پورا پورا ایمان رکھنا چاہیئے کہ مسائل شریعت کی دلیلوں میں قرآن شریف کے بعد "حدیث شریف" ہی کا درجہ ہے اور بغیر احادیثِ رسول پر ایمان لائے ہوئے نہ کوئی قرآن کے معانی و مطالب کو کما حقہٗ سمجھ سکتا ہے۔ نہ دین اسلام پر عمل کر سکتا ہے۔

اس لیے اس زمانے میں جو لوگ حدیثوں کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ لوگ گمراہ، بد مذہب بلکہ بعض تو ملحد اور مُرتد ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی کوئی تحریر پڑھنی اور ان لوگوں کے وعظوں میں شرکت حرام و ناجائز ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کی صحبت کو سمِ قاتل اور زہرِ ہلاہل سمجھ کر ان سے اجتناب و پرہیز کو لازم پکڑیں۔ یہی حکم تمام گستاخِ رسول فرقوں اور ان کی کتب کے متعلق ہے۔ خواہ یہ حضرات کتنی ہی مکاری سے اپنے اُوپر حنفی، شافعی کا لیبل چسپاں کریں۔

○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نیّت کا پھل

حدیث نمبر ۱

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَأَۃٍ یَّتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَاجَرَ اِلَیْہِ ۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام اعمال کا ثواب نیّتوں سے ہے اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جو اس نے نیّت کی جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے اور جس شخص کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کے واسطے ہو تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہوگی جس کی طرف اُس نے ہجرت کی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ

اس حدیث کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں آپ کی کُنیت "ابو حفص" اور لقب "فاروق" ہے۔ آپ قدیم الاسلام ہیں۔ آپ چالیس مردوں اور گیارہ عورتوں یا انتالیس مردوں اور تیرہ عورتوں یا پینتالیس مردوں اور گیارہ عورتوں کے مُسلمان ہونے کے بعد اسلام آئے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام

نے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر یہ خوشخبری سنائی کہ یارسول اللہ! آسمان والے حضرت عمرؓ کے اسلام لانے پر خوشی منا رہے ہیں۔ خلیفۂ اوّل امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کو اپنا ولی عہد منتخب فرمایا۔ چنانچہ آپ کی وفات کے بعد ۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کو آپ امیر المومنین منتخب ہوئے اور دس برس چند ماہ مسندِ خلافت پر رونق افروز رہے۔ اور فارس و روم کی سلطنتوں سے جہاد فرما کر ان ممالک کو خلافتِ اسلامیہ کے زیرِ نگین فرمایا۔ پھر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور ترقی کے بے شمار سامان مہیّا فرما کر ۲۸ ذوالحجہ ۲۳ھ بروز پنج شنبہ بمقام مدینہ منورہ تریسٹھ برس کی عمر میں شہادت سے سرفراز ہوئے اور روضۂ منورہ میں مدفون ہوئے۔ پانچسو انتالیس حدیثیں آپ سے مروی ہیں آپ کے فضائل و مناقب بہت زیادہ ہیں۔ جن کا مفصّل بیان ہماری کتاب "حقانی تقریریں" میں پڑھیے۔

اس حدیث کی خصوصیات

اس حدیث کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں۔

(۱) یہ بخاری شریف کی سب سے پہلی حدیث ہے اور امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس حدیث کو متعدد سندوں اور مختلف لفظوں کے ساتھ اپنی اس کتاب میں دوسرے چھ مقامات پر بھی ذکر فرمایا ہے اور وہ چھ مقامات یہ ہیں۔

کتاب الایمان[۱] ۔ کتاب العتق[۲] ۔ باب الہجرۃ[۳] ۔ کتاب النکاح[۴] ۔ کتاب الایمان[۵] ۔ کتاب الحیل[۶] ۔

۲ - امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام احمد، امام دارقطنی، امام ابن حبّان، امام بیہقی جیسے مسلم الثبوت اور بلند پایہ محدثین نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں اس حدیث کو پوری شان و شوکت کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

۳ - محدثین نے اس حدیث کو اُن بنیادی حدیثوں میں سے شمار کیا ہے۔ جن پر دین اسلام کا دارومدار ہے۔ چنانچہ اس حدیث کے بارے میں ابوداؤد محدّث کا قول ہے کہ لاکھوں احادیث کے خزانوں میں سے دین پر عمل کرنے کے لیے صرف چار

حدیثیں کافی ہیں اور ان چار میں سے ایک انما الاعمال بالنیات ہے۔

حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمدؒ نے فرمایا کہ اس حدیث میں علم دین کا ایک تہائی حصہ ہے۔ کیونکہ دین کے اعمال تین ہی قسم کے ہیں۔ قلب کے اعمال، زبان کے اعمال، باقی اعضاء کے اعمال اور اس حدیث میں اعمالِ قلب یعنی "نیت" کا ذکر ہے۔ (قسطلانی ج ا ص ۱۶۴)

مخدوم شیخ احمد کمشخانوی قدس سرہٗ نے جامع الاصول کے متمات میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزند جناب "حماد" کو نصیحت فرماتے ہوئے یہ تحریر فرمایا کہ اے نورِ نظر! میں نے پانچ لاکھ حدیثوں میں سے چن کر ایسی پانچ حدیثوں کو منتخب کیا ہے کہ اگر تم نے ان کو یاد کر کے ان پر پورے اعتماد کے ساتھ عمل کیا تو تم دونوں جہان کی سعادتوں سے سرفراز ہو جاؤ گے۔

اور وہ پانچ حدیثیں یہ ہیں:

اوّل: حدیث انما الاعمال بالنیات یعنی تمام اعمال کے ثواب کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

دوم: آدمی کے اسلام کی خوبی میں سے یہ ہے کہ وہ تمام لایعنی اور بیکار چیزوں کو چھوڑ دے۔

سوم: تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومنِ کامل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی (مومن) کے لیے اُسی چیز کو پسند نہ کرے جس کو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

چہارم: حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں بھی ہیں۔ جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے تو جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرتا رہا۔ اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لیا۔ اور جو شخص ان مشتبہ چیزوں میں پڑ گیا وہ کبھی نہ کبھی حرام میں بھی واقع ہو جائے گا۔ جیسے وہ چرواہا جو حمٰی (محفوظ شاہی چراگاہ) کے اردگرد جانور کو چراتا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ اس کا جانور کبھی نہ کبھی حمٰی میں بھی داخل ہو جائے۔ خبردار! ہر بادشاہ کے لیے حمٰی ہوتی ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ کی حمٰی اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں۔ سُن لو

اور یقین رکھو کہ بدن میں گوشت کا ایسا ٹکڑا ہے کہ جب وہ درست ہو جائے گا تو پورا بدن درست ہو جائے گا اور جب وہ فاسد ہو جائے گا تو پورا بدن فاسد ہو جائے گا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ "دل" ہے۔

پنجم : کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے تمام مسلمان سلامت رہیں۔
(البشیر القاری ص ۶۵)

۴ : بعض محدثین نے اس حدیث کو "حدیث متواتر" کہا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ حدیث سند کے آخری حصّہ کے اعتبار سے "حدیث مشہور" ہے اور سند کے ابتدائی حصّہ کے اعتبار سے "غریب" ہے۔ (قسطلانی ج ۱ ص ۶۴) واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ : اس حدیث کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا چنانچہ اس کے راوی امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی منبر پر دوران خطبہ میں اس حدیث کو فرمایا۔

۶ : عام طور پر محدثین کرام اس حدیث کو اپنی اپنی کتابوں کے شروع میں لکھتے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو اس بات پر متنبّہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے عملِ تصنیف و تالیف میں اپنی نیتوں کو درست کر لیں! کیوں؟ اس لیے کہ ؎

ہو اگر نیت بُری اچھے عمل بیکار ہیں
جاگتا ہے چور بھی مثلِ نگہبان رات بھر

توضیح الفاظ

حدیثِ مذکور میں تین الفاظ قابلِ وضاحت ہیں۔ لہٰذا ان کی تشریح حسب ذیل ہے:

نیّت دل کے قصد و ارادہ کو نیت کہتے ہیں اور اس حدیث میں نیت سے مراد خداوند تعالیٰ کی خوشنودی، اور اس کے دربار میں تقریب حاصل کرنے کا قصد و ارادہ ہے۔

ہجرت لغت میں "ہجرت" کے معنی ہیں "کسی چیز کو چھوڑ دینا" چنانچہ بعض حدیثوں میں ہجرت کا لفظ "چھوڑ دینے" کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ

ایک حدیث میں ہے کہ اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ یعنی کامل درجے کا "مہاجر" وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی تمام چیزوں کو چھوڑ دے۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں "ہجرت" یہ ہے کہ مسلمان خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کے پیش نظر اپنے دین و ایمان کی سلامتی کے لیے شہر، یا ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر یا ملک میں چلا جائے۔ جہاں اس کا دین و ایمان محفوظ رہ سکے۔

ہجرت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ دارالکفر سے دارالسّلام ہی کی طرف ہجرت ہو کیونکہ زمانۂ نبوت میں دو قسم کی ہجرت ہوئی۔ ایک دارالخوف سے دارالامان کی طرف جیسے کہ بعض صحابۂ کرام نے مکّہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت میں مکّہ اور حبشہ دونوں ہی دارُالکفر تھے۔ مگر مکّہ میں مسلمانوں کی جان و ایمان کا خوف و خطر تھا اور حبشہ میں اُن کے لیے جان و ایمان کے بارے میں امن و امان تھا۔ دوسری ہجرت دارُالکفر سے دارالاسلام کی طرف جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں ساکن و متمکن ہو جانے کے بعد مکّہ کے مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت مکّہ دارُالکفر تھا۔ اور مدینہ دارالاسلام بن چکا تھا۔

بہر کیف مختلف شارحینِ حدیث کی تقریروں سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دارالکفر سے دارالاسلام ہی کی طرف جانے میں ہجرت منحصر نہیں ہے۔ بلکہ ایک اسلامی ملک میں بھی اگر حُکام و عُمّالِ حکومت کے عقائد و نظریات اس قدر بگڑ جائیں کہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان کی اسلامی زندگی وہاں تنگ ہو جائے اور دین پر قائم رہنا مشکل ہو جائے تو اپنے دین و ایمان کی حفاظت اور سلامتی کے لیے وہاں سے کسی بھی ایسے ملک میں چلا جانا جہاں اسلامی زندگی بسر کرنے میں کوئی مزاحمت نہ ہو یہ بھی شرعی ہجرت ہی ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی دارالکفر میں مسلمان کو اپنے دین و ایمان پر قائم رہنا مشکل نظر آتا ہو اور اس کے قریب ہی میں کوئی ایسا دارالکفر ہو جو اتنا ظالم و جابر نہ ہو، بلکہ وہ کسی مسلمان کے اسلامی زندگی بسر کرنے میں کوئی مزاحمت ہی نہ کرتا ہو تو اس صورت میں اس دارالکفر سے دوسرے دارُالکفر میں چلے جانا یہ بھی شرعی ہجرت ہی کہلائے گی اور ان سب صورتوں میں بشرط اخلاص نیّت

انشاء اللہ تعالیٰ ہجرت ہی کا ثواب ملے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دُنیا یہ اسم تفضیل "ادنیٰ" کا مؤنث ہے۔ جس کے معنی ہیں "زیادہ قریب ہونیوالی" اہل لغت کا قول ہے کہ اس عالم کو "دنیا" اس لیے کہتے ہیں کہ یہ زوال کے قریب ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ چونکہ یہ بہ نسبت آخرت کے ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہے اس لیے اس کو "دُنیا" یعنی "زیادہ قریب ہونے والی" کہنے لگے۔

علماء متکلمین ہر اُس مخلوق کو "دُنیا" کہتے ہیں۔ جو آخرت سے پہلے وجود میں آئی اور صوفیاء کرام کے نزدیک ہر وہ چیز دنیا ہے۔ جو انسان کو خدا سے غافل کر دے۔ چنانچہ مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ "صوفیہ" کی ترجمانی کرتے ہوئے۔ اپنی مثنوی شریف میں فرماتے ہیں ؎

چیست دُنیا، از خُدا غافل بُدن
نے قماش و نقرۂ و فرزند و زن

یعنی خدا سے غافل ہو جانے کا نام "دُنیا" ہے۔ لباس، چاندی اور بیوی بچے، اگر انسان کو خدا سے غافل نہ کریں۔ تو یہ چیزیں دُنیا میں شمار نہیں کی جائیں گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ارشاد حدیث کا باعث اس حدیث کے ارشاد کا سبب کیا ہے؟ اور کب؟ کس موقع پر اور کیوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث صحابہ کو سنائی؟ اس کا واقعہ بہت ہی عجیب اور نہایت ہی عبرت انگیز ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان عورت جس کا نام "قیلہ" تھا۔ مگر عام طور پر لوگ اس کو "اُمِّ قیس" کہہ کر پکارتے تھے۔ اس عورت کو ایک شخص نے نکاح کا پیغام دیا۔ اُمّ قیس نے اس کو یہ جواب دیا کہ جب تک تو مکہ سے مدینہ ہجرت نہیں کرے گا۔ میں تجھ سے نکاح نہیں کروں گی۔ آخر اس شخص نے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی۔ صحابۂ کرام میں یہ بات مشہور ہو گئی۔ چنانچہ صحابۂ کرام اس شخص کو "مہاجر امّ قیس" کہنے لگے اور یہ شخص اس لقب سے اس قدر مشہور

ہوگیا کہ اس کا اصلی نام کسی کو یاد نہیں رہا۔ چنانچہ اس شخص کا اصلی نام کیا تھا؟ کسی کتاب میں بھی مجھے نہیں ملا۔ (قسطلانی ج ۱ ص ۱۶۳)

جب اس واقعہ کی خبر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے اس شخص کو تنبیہہ و ہدایت کے لیے دورانِ خطبہ میں منبر پر یہ ارشاد فرمایا کہ " انما الاعمال بالنیّات " یعنی اعمال کا ثواب تو نیتوں پر موقوف ہے۔ لہٰذا جو شخص جس نیت سے ہجرت کرتا ہے وہی اس کو ملے گا۔

شرحِ حدیث

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں۔ بُرے اعمال اور اچھے اعمال۔ بُرا عمل تو خواہ بُری نیت سے کیا جائے، خواہ اچھی نیت سے۔ اس پر ثواب ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اس لیے کہ بُرا عمل تو بہر صورت بُرا ہی ہے۔ اور باعثِ عذاب ہے۔

رہ گیا اچھا عمل۔ تو اس کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے کہ تمام اچھے اعمال خواہ دل کے اعمال ہوں، یا دوسرے اعضاء کے۔ اوامر پر عمل ہو۔ یا نواہی سے بچنا ہو۔ عبادت کے اعمال ہوں یا عادات کے ان سب اعمال پر ثواب اُسی وقت ملے گا۔ جب ان اعمال کو تقرب الی اور رضا الٰہی طلب کرنے کی نیت سے کیا جائے۔ اور اگر معاذ اللہ کوئی عمل، خواہ وہ کتنا ہی اچھا سے اچھا عمل کیوں نہ ہو خدا کی خوشنودی کی نیت سے نہ کیا جائے۔ بلکہ ریا کاری یا شہرت یا لذتِ نفس یا اور کسی غرض فاسد کی نیت سے کیا جائے تو اگرچہ وہ عمل فرض و واجب یا سُنّت و مستحب ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ہرگز ہرگز اس پر کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ بلکہ اُلٹا نقصان ایمان اور عذابِ جان کا باعث اور دونوں جہاں میں خُسران و حرمان کا سامان بن جائے گا۔

مثلاً کون نہیں جانتا کہ " نماز " ایک ایسا بہترین اور اچھا عملِ خیر ہے کہ اہم الفرائض اور افضل العبادات ہے۔ اگر خدا کی رضا و خوشنودی اور اس کے قرب رحمت کو طلب کرنے اور ادائے فرض خدا وندی کی نیت سے نماز پڑھی جائے تو سُبحان اللہ! اس کے اجر و ثواب کا کیا کہنا؟ نور ہی نور، بلکہ نُورٌ علیٰ نُور ہے۔ لیکن یہی

نماز اگر کوئی اس نیّت سے پڑھے کہ لوگ مجھے نمازی سمجھ کر میری خوب خوب عزّت اور آؤ بھگت کریں گے اور میری بزرگی کا خوب خوب شہرہ ہو گا۔ تو ظاہر ہے کہ یہ نماز جو افضل العبادات ہے اس بُری نیت سے بدترین معصیت اور گناہ کا باعث بن گئی اور ایسے نمازی کو لعنتوں کی پھٹکار اور عذاب نار کے سوا قہار و جبّار کے دربار سے اور کیا ملے گا؟

غرض ایک ہی اچھا عمل اچّھی نیت سے لائق ثواب اور بُری نیت سے باعثِ عذاب بن جاتا ہے۔

اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام اعمال کے ثواب کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کو اس کی نیت ہی پر ثواب ملتا ہے۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدۂ کُلیہ کو بیان فرمانے کے بعد اس کی ایک خاص مثال کے طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور رسول کی رضا جوئی کی نیت سے ہجرت کرتا ہے تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کے دربار میں مقبول ہوتی ہے۔" اور خُداوند قدوس اس کو اپنے فضل لاجواب سے بے حساب اجر و ثواب عطا فرماتا ہے اور جو شخص کسی دنیاوی منفعت اٹھانے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے ہجرت کرتا ہے تو اس کی ہجرت کا حاصل اور ترکِ وطن کا ماحصل وہی دنیاوی منفعت اور وہی عورت ہے۔ باقی اجر و ثواب جس دولت کا نام ہے۔ اس کے ایک ذرّہ کا کروڑواں حصّہ بھی اس کو نہیں ملے گا۔ بلکہ یہ سراسر خسارہ اور محرومی کی نحوست میں گرفتار ہو کر خائب و خاسر اور محروم و نامراد ہو کر رہ جائے گا۔

بہر حال اس حدیث کا خلاصۂ کلام اور حاصلِ مطلب یہی ہے کہ جو عملِ خیر نیک نیتی کے ساتھ کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ کتنا ہی چھوٹا عمل ہو اس پر ضرور اجر و ثواب ملے گا اور جو عملِ خیر بد نیتی کے ساتھ کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ کتنا ہی بڑا عمل کیوں نہ ہو۔ مگر ہرگز ہرگز اس پر کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

حکایت اس سلسلے میں ایک بزرگ کی حکایت بڑی ہی سبق آموز اور عبرت خیز

ہے۔ مشہور ہے کہ ایک بزرگ کے دو مُرید تھے۔ ایک مُرید نے مسجد کے دروازے
پر ایک کھونٹا گاڑ دیا اور دُوسرے مُرید نے اس کھونٹے کو اکھاڑ کر پھینک دیا
جب اُن بزرگ کو لوگوں نے ان دونوں مریدوں کی حرکتوں سے آگاہ کیا۔ تو وہ صاحب
کشف بزرگ تھے۔ انہوں نے مراقبہ کیا اور اپنے دونوں مریدوں کی قلبی نیتوں کو دیکھ
کر فرمایا کہ سبحان اللہ! دونوں کو ثواب ملا۔ حاضرین نے حیرت سے کہا کہ حضرت! ایک
نے کھونٹا گاڑا۔ دوسرے نے اکھاڑا۔ اور دونوں کو برابر ثواب ملا۔ یہ کیسے؟ بزرگ
نے زور دے کر فرمایا کہ ہاں۔ ہاں دونوں کو ثواب ملا اور دونوں کو بالکل برابر ثواب
ملا۔ جب لوگوں نے بہت زیادہ حیرانی ہوئی۔ تو آپ نے دونوں مُریدوں کو بُلا کر
لوگوں کے سامنے پوچھا کہ کیوں جی؟ تم نے مسجد کے دروازے پر کھونٹا کیوں گاڑا تھا؟
اُس نے کہا کہ حضور! میری نیت تو یہ تھی کہ مسجد لبِ سڑک تھی۔ اونٹ والے، گھوڑے
والے، بیل والے، نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آتے ہیں تو ان لوگوں کا دھیان اپنے
جانوروں میں لگا رہتا ہے۔ کہ نہ معلوم جانور کھڑے ہیں یا بھاگ گئے ہیں؟ اور وہ خوب
دل لگا کر نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس لیے میں نے وہاں ایک کھونٹا گاڑ دیا تھا۔ تاکہ
لوگ اس میں اپنے جانوروں کو باندھ کر حضورِ قلب اور اطمینان کے ساتھ نماز پڑھیں گے
بزرگ نے حاضرین سے فرمایا کہ اب بولو! تم لوگ کیا کہتے ہو؟ بتاؤ اس شخص کو ثواب ملنا
چاہیئے یا نہیں؟ تو سب لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ بیشک ضرور اس کو ثواب
ملنا چاہیئے۔ پھر بزرگ نے دوسرے مُرید سے دریافت کیا کہ کیوں جی! تم نے کھونٹے
کو اکھاڑا کیوں؟ اس نے عرض کیا کہ حضور اس مسجد کے کئی نمازی نابینا ہیں اور اندھیری
راتوں میں بھی لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں۔ تو میں نے اس نیت سے کھونٹے کو اکھاڑ دیا کہ کسی
نمازی کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔ بزرگ نے حاضرین سے دریافت فرمایا کہ کہیئے۔ اب آپ
لوگ کیا کہتے ہیں؟ اس نے ثواب کا کام کیا ہے یا نہیں؟ تو سب نے کہا کہ یقیناً اس
نے ثواب کا کام کیا ہے۔ لہٰذا اس کو ضرور ثواب ملنا چاہیئے۔
غور فرمائیے کہ دونوں مُریدوں کا عمل ایک دُوسرے کے بالکل خلاف ہے مگر

چونکہ دونوں کی نیتیں اچھی تھیں۔ اس لیے دونوں کو برابر ثواب ملا۔

حکایت اسی طرح حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ نے بھی مثنوی شریف میں ایک بہت ہی مؤثر حکایت اس عنوان پر تحریر فرمائی ہے! وہ لکھتے ہیں کہ ؎

خانۂ نو ساخت روزے نو مُرید
پیر آمد، خانۂ او را بدید!!

یعنی ایک مُرید نے جو بالکل نیا نیا مُرید ہوا تھا۔ اُس نے ایک نیا مکان بنایا اور اپنے پیر کو اس کے افتتاح کے لیے بلایا۔ چنانچہ پیر صاحب تشریف لائے اور پورے مکان کا معائنہ فرما کر مُرید سے دریافت کیا کہ ؎

روزن از بہرِ چہ کردی اے رفیق
گفت تا نور اندر آید از طریق

یعنی پیر نے مُرید سے پُوچھا کہ تم نے مکان میں روشندان کس نیت سے بنایا ہے؟ مُرید نے جواب دیا کہ میری نیت تو یہی تھی کہ روشندان کے ذریعے میرے گھر میں روشنی آئے گی۔

مُرید کی زبان سے یہ سُن کر پیر صاحب کو بڑا رنج و ملال ہوا اور تڑپ کر فرمایا کہ

گفت آں فرع است ایں باید نیاز
تا ازیں رہ بشنوی بانگِ نماز
نور خود اندر تبع می آیدت
نیّت آں کُن کہ آں می بایدت

یعنی پیر کامل نے فرمایا کہ اگر تو نے روشندان بناتے وقت یہ نیت کر لی ہوتی کہ اس کے ذریعے اذان کی آواز تیرے گھر میں آئے گی۔ تو روشنی بھی آجاتی اور تجھ کو تیری اس نیک نیتی پر ثواب بھی ملتا۔ آئندہ سے یاد رکھ کہ نیت ایسی کیا کر جو تجھ جیسے مومن کے شایان شان ہے۔ یعنی ہر چھوٹے بڑے عملِ خیر کو اچھی نیت سے کر۔ کیونکہ تمام اعمال کے ثواب کا دارومدار اچھی نیتوں پر ہے۔

ایک عمل چند نیّت

جب اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ عمل کے ثواب کا دارومدار نیّت پر ہے تو اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایک عمل پر ایک ہی اچھی نیّت ہوگی تو ایک ہی ثواب ملے گا۔ اور اگر ایک عمل کرتے وقت چند اچھی اچھی نیتیں کرلی جائیں تو جتنی تعداد میں نیتیں ہوں گی اتنی ہی تعداد میں ثواب ملے گا۔ مثلاً تمہارا کوئی بھائی مفلس و محتاج ہے۔ اب اگر اس نیّت سے تم نے اس کی مالی امداد کی کہ تم اپنے بھائی کی مدد کر رہے ہو۔ تو تمہیں اپنے رشتہ دار کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا ایک ثواب ملے گا اور اگر تم نے اس نیّت سے اس کی مالی امداد کی ہے کہ وہ ایک مفلس اور غریب آدمی ہے۔ تو تم کو صرف ایک مفلس کی مدد کرنے کا ثواب ملے گا اور اگر تم نے اس کی امداد کے وقت دو نیت کرلی کہ تم اپنے ایک رشتہ دار کی مدد بھی کر رہے ہو اور امتِ رسول کے ایک محتاج کی مالی امداد بھی کر رہے ہو تو چونکہ تمہاری اچھی اچھی نیتیں دو ہیں۔ اس لیے تم کو دو ثواب ملے گا۔ ایک ثواب اپنے رشتہ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا اور ایک امتِ رسول کے ایک مفلس کی امداد کرنے کا۔

اسی طرح مسجد میں داخل ہونا ایک عمل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دخول مسجد کے وقت صرف ادائے نماز کی ایک ہی نیت کرے تو اُس کو ایک ہی ثواب ملے گا اور اگر اُس نے دخول مسجد کے وقت ادائے نماز کے ساتھ یہ نیت بھی کرلی کہ میں مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے کی دُعائیں بھی پڑھوں گا۔ مسجد میں چند منٹ کا اعتکاف کروں گا۔ جماعت کا انتظار کرونگا۔ جتنی دیر مسجد میں بیٹھا رہوں گا۔ دنیاوی خرافات سے بچا رہوں گا۔ مسجد کے نمازیوں میں سے جو صالحین ہیں ان سے ملاقات کروں گا۔ ان لوگوں کو سلام کرونگا۔ مسجد میں بیٹھ کر تلاوت کروں گا یا وظیفہ پڑھوں گا۔ یا نمازیوں کو کوئی مسئلہ بتاؤں گا یا ان سے کوئی مسئلہ سیکھوں گا۔ دیکھ لیجئے مسجد میں داخل ہونا ایک ہی عمل ہے۔ مگر چونکہ یہ عمل چند نیتوں سے کیا گیا ہے اس لیے جتنی تعداد میں اچھی اچھی نیتیں ہوں گی۔ اتنی ہی تعداد میں اس ایک عمل کا ثواب ملے گا۔ غرض ایک عمل پر اگر کوئی شخص پچاس نیتیں یا پانچسو نیتیں یا پچاس ہزار نیتیں کرلے تو صرف ایک عمل پر خداوند کریم اپنے کرم بے حساب سے

پاس ہزار ثواب مرحمت فرمائے گا۔ اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کی رحمت اعلان ہے کہ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ٥ یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل بہت ہی بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلم۔

بُری نیت کا انجام

بہر حال اس حدیث کا حاصل یہی ہے کہ ایک ہی عمل اچھی نیت سے باعثِ ثواب۔ اور بُری نیت سے لائق عذاب ہو جایا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیت کی خرابی کی وجہ سے بہتر سے بہتر کام اور افضل سے افضل اعمال صالحہ کرنے والے قیامت کے دن منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ چنانچہ مسلم شریف کی ایک حدیث ہے۔ جس کے تصوّر سے بدن کا ایک ایک رونگٹا کانپنے لگتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جن لوگوں کا فیصلہ کیا جائیگا۔ ان میں سے ایک شہید ہوگا۔ یہ لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ یہ یہ نعمتیں میں نے تجھے دی تھیں۔ شہید اقرار کرے گا کہ بیشک تو نے دی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے میری ان نعمتوں کے بدلے میں کون کون سے اعمال کئے ہیں؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا۔ یہاں تک کہ میں شہید کر دیا گیا اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ تو جھوٹا ہے تو نے میری رضا کے لیے جہاد نہیں کیا۔ بلکہ تو اس نیت سے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں گے۔ تو لوگوں نے (دُنیا میں) بہادر کہہ دیا اور تجھے تیری نیت کا پھل مل گیا) پھر اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں اپنا حکم صادر فرمائیگا اور اس کو منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے آگ میں ڈال دیا جائیگا۔

دوسرا شخص ایک عالم ہوگا جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن پڑھا ہوگا یہ لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فلاں فلاں نعمتیں میں نے تجھ کو دی تھیں۔ وہ کہے گا کہ بے شک تو نے عطا فرمائی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے میری ان نعمتوں کی شکر گزاری میں کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور تیری رضا کے لیے قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹ بولتا ہے تُو نے تو علم اس لیے پڑھا

پڑھایا تھا کہ لوگ تجھ کو عالم کہیں گے۔ اور قرآن اس لیے پڑھا تھا کہ لوگ تجھ کو قاری کہیں گے۔ تو لوگوں نے تجھ کو (دنیا میں) عالم قاری کہہ دیا (اور دنیا میں تیرا اجر تجھ کو مل گیا) پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو بھی منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

تیسرا شخص وہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے بہت وسیع روزی دی اور ہر قسم کا مال ومتاع عطا کیا۔ یہ لایا جائیگا اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ میں نے یہ یہ نعمتیں تجھ کو دی تھیں وہ ان نعمتوں کے ملنے کا اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو نے میری ان نعمتوں کا کون کون سے اعمال کر کے شکریہ ادا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے تیرے لیے ہر اُس راہ میں مال خرچ کیا جس کو تو پسند فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تو نے میری رضا کے لیے مال نہیں خرچ کیا۔ بلکہ تو نے اس لیے مال خرچ کیا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں گے۔ تو لوگوں نے تجھ کو سخی کہہ دیا (اور دُنیا ہی میں تیری نیت کا ثواب تجھ کو مل گیا) پھر وہ بھی خدا کے حکم سے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے آگ میں داخل کر دیا جائے گا۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم و مسلم ج ۲ ص ۱۴۰)

اچھی نیّت کا ثمرہ

اب ایک حدیث اور ملاحظہ فرمائیے اور اس حدیث کی روشنی میں دیکھئے کہ اچھی نیت سے عمل کرنے والے کے اعمال کے ثمرات و برکات کیا ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ ان کو کیسے کیسے درجات عطا فرماتا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے کہ

ایک شخص نے عہد کیا کہ میں چھپ کر صدقہ کروں گا چنانچہ یہ شخص رات کو صدقہ کا مال لے کر نکلا اور ایک چور کو مسکین سمجھ کر صدقہ کی رقم اس کے ہاتھ میں رکھ دی۔ صبح کو اس کا چرچا ہو گیا اور لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ کسی نے رات میں ایک چور کو صدقہ دے دیا۔ جب اس شخص کو خبر ہوئی۔ تو اس نے کہا کہ یا اللہ! تیرے ہی لیے حمد ہے (افسوس) میرا صدقہ ایک چور کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پھر دوسری رات کو صدقہ لے کر چلا تو ایک زناکار عورت کو محتاج سمجھ کر اس کے ہاتھ میں صدقہ کا مال رکھ دیا

صبح کو پھر لوگوں میں اسکا چرچا ہونے لگا کہ رات میں کسی نے ایک زناکار عورت کو صدقہ دے دیا۔ جب اس شخص کو پتہ چلا تو پھر اُس نے یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ! تیرے ہی لیے حمد ہے (افسوس) میں نے ایک زناکار عورت کو صدقہ دے دیا۔ پھر تیسری رات یہ صدقہ لے کر نکلا تو ایک مالدار آدمی کو فقیر سمجھ کر اس کو صدقہ دے دیا۔ صبح کو پھر لوگوں نے اس کا تذکرہ اور اس پر تنقید و تبصرہ کرنا شروع کر دیا۔ تو اس نے یہی کہا کہ یا اللہ! تیرے ہی لیے حمد ہے (افسوس) کہ میرا صدقہ چور، زانیہ اور مالدار کے ہاتھ میں پہنچا۔ یہ شخص اسی افسوس و تفکر میں سو گیا۔ تو خواب میں ایک فرشتہ نے خدا کی طرف سے اس کو یہ خوشخبری سنائی کہ تیرا ہر اک صدقہ مقبول ہوا۔ تو نے چور کو صدقہ دیا تو امید ہے کہ وہ اُس رات کو چوری سے بچے گا اور زانیہ کو صدقہ دیا تو امید ہے کہ وہ اس رات کو زناکاری سے بچے گی۔ اور مالدار کو صدقہ دیا۔ تو امید ہے کہ اس کو عبرت ہو اور وہ بھی صدقہ دینے لگے۔ (مشکوٰۃ باب الانفاق)

فقط نیّت پر ثواب

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں تحریر فرمایا ہے کہ

بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب فرشتے بندوں کے نامہ اعمال کو آسمانوں پر لے کر جاتے ہیں۔ اور دربار الٰہی میں پیش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلْقِ تِلْكَ الصَّحِيْفَةَ اَلْقِ تِلْكَ الصَّحِيْفَةَ ۔ دو مرتبہ فرماتا ہے کہ اس نامۂ اعمال کو پھینک دو۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ الٰہی! تیرے اس بندے نے نیک اعمال کیے ہیں۔ جن کو ہم نے دیکھ کر اور سُن کر لکھا ہے۔ ہم اس کو کیونکر پھینک دیں؟ تو خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ لَمْ يُرِدْ وَجْهِيْ اس بندے نے اس عمل میں میری رضا کی نیّت نہیں کی تھی۔ اس لیے یہ میرے دربار میں مقبول نہیں۔

پھر ایک دوسرے فرشتہ کو اللہ تعالیٰ یہ حکم فرماتا ہے کہ اُكْتُبْ لِفُلَانٍ كَذَا وَكَذَا یعنی فلاں بندے کے نامۂ اعمال میں فلاں فلاں عمل لکھ دے۔ فرشتہ عرض کرتا ہے کہ خداوندا! یہ عمل تو اس بندے نے نہیں کیا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ گو اس نے یہ عمل

نہیں کیا۔ مگر اس کی نیت تو اس عمل کے کرنے کی تھی۔ اس لیے میں اس کی نیت پر اس کو اس عمل کا اجر دوں گا۔

اسی لیے بعض حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ یعنی مومن کی نیّت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ نیک عمل پر تو ثواب اسی وقت ملے گا۔ جب نیّت اچھی ہو اور اگر نیت بُری ہو تو نیک عمل پر کوئی ثواب ہی نہیں۔ مگر اچھی نیّت پر تو بہر حال ثواب ملے گا۔ خواہ عمل کرے یا نہ کرے۔ اس لیے مومن کی نیّت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ اسی لیے بعض صوفیاء کرام نے فرمایا ہے کہ ؎

ہر کرا اندر عمل اخلاص نیست
درجہاں از بندگانِ خاص نیست

یعنی جس شخص کے عمل میں اخلاص نہیں ہے وہ دنیا میں خدا کے خاص بندوں میں سے نہیں ہے ؎

ہر کرا کار از برائے حق بود
کارِ او پیوستہ بارونق بود

جس شخص کا عمل خدا کی رضا کے لیے ہوتا ہے۔ ہمیشہ اس کا عمل بارونق رہا کرتا ہے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۳۶)

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا کہ فِیْہِ الْحَثُّ عَلٰی نِیَّۃِ الْخَیْرِ مُطْلَقًا وَاِنَّہٗ یُثَابُ عَلَی النِّیَۃِ یعنی اس حدیث میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ ہر حالت میں نیت اچھی ہونی چاہیئے اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیت پر ثواب دیا جاتا ہے۔ (عینی ج ۱ ص ۳۲۸)

فوائد و مسائل

اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد و مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے جن کو ہم نمبروار تحریر کرتے ہیں۔

۱: آپ یہ پڑھ چکے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "مہاجر ام قیس" کی تنبیہ

اور ہدایت کے لیے یہ حدیث ارشاد فرمائی ۔ جنہوں نے ایک عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے ہجرت کی تھی ۔ بلا شبہ وہ تنبیہہ وہدایت کے قابل تھے ۔ اب اس تنبیہہ وہدایت کی ایک صورت تو یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سامنے بلا کر مجمع عام میں ان کو ان کی غلطی پر ٹوکتے اور ڈانٹتے ۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ان کو تنہائی میں بلا کر ان کی غلطی پر ان کو تنبیہہ فرما دیتے ۔ تیسری صورت یہ تھی کہ مجمع عام میں تمام مسلمانوں کو واعظ و نصیحت سُنانے کے ضمن میں ان کو متنبہ فرما دیتے ۔ تاکہ ان کی پردہ پوشی کے ساتھ ان کی تنبیہہ و ہدایت ہو جاتی ۔ چنانچہ حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آخری صورت کو اختیار فرمایا کہ خطبہ پڑھتے پڑھتے عام الفاظ میں اور عام مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہُوئے ان کو تنبیہہ فرما دی ، اور "مہاجر ام قیس" جو اس خطبہ کو سُن رہے تھے انہوں نے خوب اچھی طرح سمجھ لیا کہ کسی عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے ہجرت کرنے میں کوئی اجر و ثواب نہیں ہے ۔ اس جملہ سے حضور نے مجھ کو تنبیہہ فرمائی ہے ۔

نصیحت کی پہلی دونوں صورتوں کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لیے اختیار نہیں فرمایا کہ پہلی صورت میں ان کی بڑی بے آبروئی اور رسوائی ہوتی اور دوسری صورت میں بھی ان کو انتہائی ندامت و شرمندگی ہوتی ۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نصیحت و اصلاح کے لیے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ منبر پر خطبہ پڑھتے ہُوئے ان کو تنبیہہ فرما دی اور اس انداز میں کہ ان کو ذلت و رسوائی سے بچاتے ہوئے اور ان کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے ان کی اصلاح وہدایت فرمائی ۔

سبحان اللہ! یہ ہے اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ کا جلوہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں یہ حکم دیا کہ اے محبوب! آپ لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دیجئے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقۂ دعوت "حکمت" و "موعظ حسنہ ہے"۔

۲ : حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ سے پتہ چلا کہ کسی گناہگار مسلمان کو نصیحت کرنے میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ و خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس گنہگار مسلمان کی

تذلیل و تحقیر اور اس کی بے آبروئی و رسوائی نہ کی جائے۔ نہ اس کو ایسے تلخ و درشت لہجے میں ڈانٹ پھٹکار کر نصیحت کی جائے کہ اس غریب کو ندامت و شرمندگی سے عرق عرق ہو جانا پڑے۔

جو علماء کرام وعظ و تقریر میں سخت کلامی یا تلخ و ترش لہجہ یا دلخراش الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ ان کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس طریقۂ تبلیغ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُسوۂ حسنہ کو نمونۂ عمل بنانا چاہیئے۔

۳: اب رہا یہ سوال کہ وہ مخلوط عمل جس میں دین و دنیا کی دونوں غرضیں ملی جلی ہوں۔ مثلاً ایک شخص حج کے لیے جاتا ہے اور کچھ تجارتی منفعت کا پہلو بھی اس کے پیشِ نظر ہے تو اس صورت میں اس کو ثواب ملے گا یا نہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ مخلوط عمل کی چند صورتیں ہیں اگر عمل کا باعث و محرک صرف منفعتِ دنیا ہے۔ عبادت کرتا تو ہے مگر اس کا مقصود نہیں بناتا۔ مثلاً اس کے سفرِ مکہ و مدینہ کا اصل مقصد تجارت ہی ہے اور اس نے تجارت ہی کی نیت سے یہ سفر کیا ہے اس سفر کا باعث و محرک حج نہیں ہے مگر چونکہ حج کا موسم تھا۔ اس لیے حج بھی کر لیا اور وہ بھی اس نیت سے کہ اگر حج نہیں کیا تو لوگ بُرا بھلا کہیں گے۔ تو ظاہر ہے کہ اس حج پر کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔

اور اگر عمل کا محرک اور باعث عبادت اور نفعِ آخرت ہے۔ مگر اس کے ساتھ تجارت وغیرہ دنیاوی منفعت کا مقصد بھی ملا ہوا ہے۔ مثلاً سفرِ حرمین شریفین کا اصل مقصد تو حج ہی کرنا ہے۔ مگر یہ بھی خیال ہے کہ اگر کوئی حلال تجارت کا موقع مل گیا تو کچھ کاروبار اور بیوپار بھی کر لوں گا۔ تو اس صورت میں جس قدر دنیاوی منفعت کی نیت شامل ہوگی۔ اُسی نسبت سے ثواب میں کمی ہو جائے گی اور اگر عمل کا مقصد صرف رضاء الٰہی کی طلب اور خالص عبادت ہی کا جذبہ ہے اور بال برابر بھی دنیاوی منفعت کا خیال نہیں۔ مثلاً سفر مکہ و مدینہ میں صرف خالص حج و زیارت ہی کی نیت ہے۔ تجارت یا دنیاوی منفعت کا خیال تک نہیں آیا ہے۔ تو یقیناً یہ اعلیٰ درجے کی عبادت اور اس حج و زیارت پر کامل

درجے کا ثواب ملے گا۔

نوٹ : حج کے سفر بلکہ خالص ایامِ حج میں حلال تجارت بلاشبہ یقیناً جائز ہے لیکن ہر حاجی کو خاص طور پر اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ تجارت کو اس سفر کا مقصود نہ بنائے بلکہ خالص حج وزیارت ہی کی نیت سے یہ سفر کرے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر وہاں کچھ خرید و فروخت کر کے کچھ نفع اُٹھالے تو اس میں گناہ نہیں! واللہ اعلم۔

***

ارکانِ اسلام

حدیث نمبر ۲

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَارِزًا یَوْمًا لِلنَّاسِ فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ الْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِکَتِهٖ وَبِلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ قَالَ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکَ بِهٖ وَتُقِیْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤَدِّیَ الزَّکٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ قَالَ مَا الْاِحْسَانُ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ قَالَ مَتٰی السَّاعَةُ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَسَاُخْبِرُکَ عَنْ اَشْرَاطِهَا اِذَا وَلَدَتِ الْاَمَةُ رَبَّهَا وَاِذَا تَطَاوَلَ رُعَاةُ الْاِبِلِ الْبُهْمُ فِی الْبُنْیَانِ فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الْاٰیَةَ ثُمَّ اَدْبَرَ فَقَالَ رُدُّوْهُ فَلَمْ یَرَوْا شَیْئًا فَقَالَ هٰذَا جِبْرِیْلُ جَاءَ یُعَلِّمُ النَّاسَ دِیْنَهُمْ۔

(بخاری باب سوال جبریل الخ صہ ۱۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ایک دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے ملاقات کے لیے مکان سے باہر تشریف فرما تھے۔ تو ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ ایمان کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ایمان

یہ ہے کہ اللہ کو، اور اس کے فرشتوں کو، اور اس کی ملاقات کو، اور اس کے رسولوں کو، اور موت کے بعد اُٹھنے کو تو دل سے مان لے۔ اس نے کہا اسلام کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تو خاص اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرے۔ اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے جو فرض ہے اور رمضان کے روزے رکھے۔ اُس نے کہا کہ احسان کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے پس اگر تو اس کو نہیں دیکھتا (تو اس طرح عبادت کر) کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اُس نے کہا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ ہاں میں ابھی تجھ کو قیامت کی کچھ نشانیاں بتاتا ہوں (جو یہ ہیں) جبکہ باندی اپنے مولیٰ کو جنے گی اور اونٹوں کے چرواہے کالے کالے رنگ والے بڑی بڑی عمارتوں میں فخر و گھمنڈ کرنے لگیں گے یہ (علم قیامت) ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر حضورؐ نے اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ کی آیت تلاوت فرمائی (جس میں قیامت وغیرہ پانچ چیزوں کا ذکر ہے) پھر وہ (سائل) واپس چلا گیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ اس کو واپس بلا لاؤ۔ تو لوگوں کو کچھ نظر نہیں آیا۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ حضرت جبریل تھے جو لوگوں کو دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔

حضرت ابوہریرہ

اس حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بہت ہی عبادت گزار، انتہائی متواضع اور پرہیزگار صحابی ہیں۔ ابوسعید کا بیان ہے کہ یہ روزانہ بارہ ہزار رکعت نماز نفل پڑھتے تھے۔ آپ یمن کے قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں آپ کا نام "عبد شمس" تھا۔ ۷ھ میں جنگِ خیبر کے بعد مسلمان ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد آپ کا نام عبد الرحمٰن یا عبد اللہ رکھا گیا۔ ان کو بلیوں سے بڑی محبت تھی۔ ایک دن حضورؐ نے ان کی آستین میں ایک بلی کو دیکھا۔ تو ان کو یا اباہریرہ (اے بلی کے باپ) کہہ کر پکارا۔ اس دن سے آپ کا یہ لقب اس قدر مشہور ہو گیا کہ لوگ آپ کا اصلی نام ہی بھول گئے۔ اسی لیے آپ کے نام میں بڑا اختلاف ہے۔ آپ

اصحاب صُفّہ میں سے ہیں۔ آپ نے ایک دن حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یارسول اللہ! میں آپ کی حدیثوں کو بھول جاتا ہوں تو حضورؐ نے حکم دیا کہ تم اپنی چادر کو زمین پر پھیلادو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی چادر پھیلا دی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ حدیثیں بیان فرمائیں اور ان سے ارشاد فرمایا کہ اس چادر کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگالو۔ اس کے بعد حضرت ابوہریرہ کا حافظہ اتنا قوی ہوگیا۔ کہ جو کچھ حضور سے سُنا اس کو عمر بھر فراموش نہیں کر سکے۔ آٹھ سو صحابہ اور تابعین حدیث میں آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ نے پانچ ہزار تین سو چوہتّر حدیثیں روایت فرمائی ہیں۔ جن میں سے چار سو چھیالیس حدیثیں بخاری شریف میں ہیں۔ ۵۹ھ میں اٹھہتر سال کی عمر پاکر مدینہ منورہ میں وصال فرمایا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

(اکمال۔ قسطلانی ج ۱ صـ ۲۱۲ عینی ج ۱ صـ ۱۲۶)

اس حدیث کی شان

۱: اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے کتاب التفسیر اور کتاب الزکوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے۔ اور امام مسلم اور امام نسائیؒ نے کتاب الایمان میں۔ امام ابنِ ماجہ نے سُنن دفتن میں۔ امام ابوداؤد نے "سنت" میں متعدد سندوں اور مختلف لفظوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اسی طرح امام ترمذی و امام احمد وغیرہ محدثین نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں اس حدیث کو درج فرمایا ہے! امام بغوی نے اپنی دونوں کتابوں "مصابیح" اور "شرح السنۃ" کا آغاز اسی مضمون کی حدیث سے کیا ہے اور حضرت علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث تمام وظائف اور ظاہری و باطنی عبادتوں کی جامع ہے۔ (فیوض الباری ج ۱ صـ ۱۸۷)

۲: حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی علیہ الرحمہ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ اس حدیث کو علماء محدثین "حدیث جبریل" یا "حدیث ام الاحادیث" یا "اُم الجوامع" کہتے ہیں۔ اس کا نام "حدیث جبریل" اس لیے ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک آدمی کی شکل میں آکر حضور سے سوال وجواب کیا اور اس کا لقب "ام الاحادیث" اس طرح ہوگیا کہ جس طرح قرآن کی سورۂ فاتحہ کا نام "اُم القرآن"

رکھ دیا گیا۔ "اُمّ" اصل اور جڑ کو کہتے ہیں جس طرح سورۂ فاتحہ اجمالی طور پر تمام قرآنی مضامین کی جامع، اور جڑ ہونے کی وجہ سے "اُمّ القرآن" یعنی قرآن کی اصل اور جڑ کہلاتی ہے۔ اسی طرح یہ حدیث چونکہ تمام احادیثِ نبویہ کے مضامین کو اجمالی طور پر اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس لیے یہ "اُمّ الاحادیث" یا "اُمّ الجوامع" کہلاتی ہے۔ یعنی یہ تمام حدیثوں کی اصل اور جڑ ہے۔

توضیح الفاظ

اس حدیث میں مندرجہ ذیل دو الفاظ کی توضیح و تشریح بہت اہم اور ضروری ہے جو حسب ذیل ہے:

عبادت

پرستش کرنا۔ پوجنا۔ یعنی انسان کسی کو اپنا خدا مان کر اس کی انتہائی تعظیم کرے اور اس کے سامنے اپنے کو انتہائی ذلت اور پستی میں سمجھے اور اس کے حضور اس قدر ذلیل اور پست بن جائے کہ جس کے بعد ذلت اور پستی کا کوئی درجہ ہی نہ ہو۔

واضح رہے کہ عبادت کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ جس کی عبادت کی جائے اس کے معبود (خدا) ہونے کا اعتقاد بھی ہو۔ عبادت کرنے والے کو "عابد" اور جس کی عبادت کی جائے اس کو "معبود" کہتے ہیں۔

تعظیم و عبادت میں فرق

تعظیم و عبادت میں یہی فرق ہے کہ "عبادت" میں تعظیم کے ساتھ اس ذات کی اُلوہیت، اور واجب الوجود اور مستحقِ عبادت ہونے کا اعتقاد بھی ہو اور تعظیم میں یہ اعتقاد نہیں ہوتا۔ لہٰذا خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہر "عبادت" "تعظیم" ہے۔ مگر ہر تعظیم عبادت نہیں ہے اور غیر اللہ کی عبادت تو شرک ہے۔ مگر غیر اللہ کی تعظیم ہرگز ہرگز شرک نہیں بلکہ بعض غیر اللہ کی تعظیم تو فرضِ عین ہے۔ جیسے کعبہ معظمہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام وغیرہ یہ سب غیر اللہ ہیں اور بلاشبہ ان کی عبادت کرنا تو کھلا ہوا شرک ہے مگر ان کی تعظیم لازم الایمان اور فرضِ عین ہے۔

جو لوگ عبادت اور تعظیم کے اس فرق سے ناواقف ہیں وہ کسی غیرُ اللہ کی تعظیم

کرتے ہوئے دیکھ کر جھٹ "شرک" کا فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھئے کہ غیر اللہ کی تعظیم شرک اور عبادت اسی وقت قرار دی جائے گی۔ جب کسی کو خدا سمجھ کر اس کی تعظیم کی جائے۔ اس کے علاوہ غیر اللہ کی تعظیم کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ کوئی بھی ہرگز ہرگز "شرک" نہیں کہی جا سکتی ہیں۔

شرک شرک کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو خدا ماننا یا عبادت کے لائق سمجھنا یا خدا کی صفات خاصہ میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہ نے اشعۃ اللمعات ج ا صد ۶۱ پر تحریر فرمایا کہ شرک تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ کی طرح کسی کو واجب الوجود مانے دوسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی کو خالق مانے۔ تیسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرے۔

(تعظیم و عبادت اور شرک کی مزید تفصیل ہماری کتاب عرفانی تقریریں میں پڑھ لیجئے)

شرح حدیث یہ مختصر حدیث ہے۔ یہی حدیث دوسری سندوں کے ساتھ مفصل بھی آئی ہے۔ جن میں آسمانی کتابوں، تقدیر، نیز حج کا بھی ذکر آیا ہے۔ بہرحال اس حدیث میں جن چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ ہم ان پر قدرے تفصیل کے ساتھ کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

حدیث کا مطلب بالکل واضح اور ظاہر ہے کہ ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ملاقات کی غرض سے بجائے مکان کے میدان کی کھلی فضا میں تشریف فرما تھے یعنی حضور کا دربارِ عام تھا اور صحابہ بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے کہ اتنے میں حضرت جبریل علیہ السلام ایک آدمی کی شکل و صورت میں رونق افروز ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ تو حضور نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی ملاقات اور اس کے رسولوں کو صدق دل سے مان لو اور مرنے کے بعد اٹھنے اور قیامت قائم ہونے پر بھی سچے دل سے یقین رکھو۔ اس کے بعد حضرت جبریل نے دوسرا سوال کیا کہ اسلام کیا ہے؟ تو حضور نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور شرک نہ کرو اور نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ

دیتے رہو اور رمضان کا روزہ رکھو۔ پھر حضرت جبریل نے تیسرا سوال کیا کہ احسان کیا ہے؟
تو حضور نے یہ جواب دیا کہ عبادت میں احسان یعنی اچھائی یہ ہے کہ تم خدا کی عبادت اس
طرح توجہ اور اخلاص کے ساتھ کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور اگر اتنی توجہ اور حضورِ
قلب تم کو حاصل نہ ہو سکے۔ تو کم سے کم یہی دھیان رکھو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔ پھر
حضرت جبریل نے چوتھا سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو حضور نے جواب میں یہ فرمایا
کہ اس بات کو میں تم سے زیادہ نہیں جانتا۔ بلکہ اس کے بارے میں جتنا تم کو علم ہے
اتنا ہی مجھ کو بھی علم ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کے سامنے
قیامت کی نشانیوں میں سے دو نشانیوں کا ذکر فرمایا۔ اول یہ کہ لونڈی اپنے مولی کو
جنے گی۔ دوم یہ کہ کالے کلوٹے اونٹوں کے چرواہے اونچی اونچی بلڈنگوں اور محلوں میں
فخر و تکبر کریں گے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ قیامت کا علم ان پانچ علموں میں سے ہے جن
کو خدا کے سوا کوئی شخص اپنی عقل و درایت یا فہم و فراست سے نہیں جان سکتا (ہاں
اگر خدا کسی کو بتادے تو وہ خدا کے بتانے سے ضرور جان لے گا)۔

پھر بطورِ ثبوت کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ لقمان کی آخری آیت تلاوت
فرمائی کہ:

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج
وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ
مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ م بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ط
إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

(یعنی اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش اُتارتا ہے اور وہی
بچہ دانیوں میں جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کریگا؟
اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا؟ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے
والا اور خبر دینے والا ہے)۔

اس کے بعد حضرت جبریل مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر حضور نے صحابہ کو حکم دیا

کہ اس آدمی کو واپس بُلا کر لاؤ۔ مگر جب صحابہ اس کی تلاش میں نکلے۔ تو انہیں دُور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ آدمی حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔ اس لیے آئے تھے کہ تم کو تمہارے دین کی باتیں تعلیم فرمائیں۔

حدیث مذکور میں خاص طور پر چار چیزوں کا ذکر ہے۔ ایمان[۱] - اسلام[۲] - احسان[۳] قیامت[۴] - اب ان چاروں کے بارے میں ہم کچھ تفصیل کے ساتھ عرض کرتے ہیں:

ایمان

ایمان کے معنی تصدیق کرنا۔ یعنی سچے دل سے مان لینا ہے۔ اس حدیث میں پانچ چیزوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ (۱) اللہ پر (۲) فرشتوں پر (۳) اللہ کی ملاقات پر (۴) رسولوں پر (۵) موت کے بعد اٹھنے پر۔

اب ذرا ان پانچوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

اللہ پر ایمان

اللہ پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو موجود، واجب الوجود، واحد حقیقی، وحدہٗ لاشریک لہٗ خالق کائنات مانتے ہوئے اس کی تمام صفات مثلاً حیات، علم، قدرت، ارادہ، کلام، سمع، بصر، تکوین کو صدق دل سے مان کر اس پر یقین کامل رکھا جائے اور اس کو ہر عیب و نقص سے پاک مانتے ہوئے اس کو ہر صفتِ کمال کے ساتھ مانا جائے۔

فرشتوں پر ایمان

فرشتوں پر ایمان لانے سے یہ مراد ہے کہ صدق دل سے یہ مان لیا جائے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک نوری مخلوق اور اس کے محترم بندے ہیں۔ جن میں گناہوں کا مادہ ہی نہیں۔ وہ ہر چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم اور پاک ہیں۔ نہ وہ عورت ہیں نہ مرد۔ نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ بس خُدا کی بندگی ان کی زندگی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ○ یعنی وہ کبھی بھی اور کسی کام میں بھی اور کسی حال میں اللہ کی کوئی نافرمانی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ خداوند تعالیٰ جو کچھ انہیں حکم دیتا ہے وہی کرتے ہیں۔ کوئی وحی لاتا ہے۔ کوئی پانی برساتا ہے۔

کوئی انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔ کوئی مومنین کے لیے رحمت و مغفرت کی دعائیں کرتا ہے۔ غرض جس کو خدا نے جس کام میں لگا دیا وہی کرتا ہے اور سب خدا کی عبادت و اطاعت میں مصروفِ عمل ہیں۔

واضح رہے کہ فرشتوں کے وجود کا انکار کرنا۔ یا ان پر کوئی عیب لگانا۔ یا ان کی توہین کرنا کفر ہے۔

لقاءِ الٰہی پر ایمان

خدا کی ملاقات پر ایمان کا یہ مطلب ہے کہ مرنے کے بعد حشر و نشر اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری اور اپنے اعمال کی پیشی اور جواب دہی اور جنّت و دوزخ وغیرہ پر دل سے اعتقاد رکھنا۔

رسولوں پر ایمان

رسولوں پر اس طرح ایمان لانا ضروری ہے کہ جتنے انبیاء و مُرسلین دنیا میں تشریف لائے وہ سب اللہ کے مقدس بندے اور اس کے برگزیدہ پیغمبر ہیں۔ وہ سب سچے، اور وہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے وہ سب حق ہے اور ان سب نبیوں اور رسولوں نے اپنے فرائضِ نبوت کو کماحقہ ادا فرمایا۔

نوٹ: واضح رہے کہ کسی نبی یا رسول کا انکار کرنا یا کسی نبی و رسول کی ادنیٰ سی توہین و تنقیص یا ان کی شان میں گستاخی و بے ادبی یا ان کی کتابوں کا انکار یا ان کی شریعتوں کے کسی ایک حکم کا انکار، یا ان کی کسی ایک سُنّت کی تحقیر کرنا کفر ہے۔ اسی طرح کسی غیر نبی کو نبی ماننا بھی کفر ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی و رسول کی تعظیم و تکریم فرضِ عین اور واجب الایمان ہے بلکہ تمام فرائض کی اصل اور جان ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "خاتم النبیین" ہونے کا عقیدہ بھی ضروریاتِ ایمان میں سے ہے۔ جو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کا وجود مانے۔ یا کسی نبی کا آنا جائز و ممکن ٹھہرائے۔ وہ کافر ہے۔

اسلام کے معنی

اسلام کے معنی لغت میں "فرماں بردار ہو جانا" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دینِ برحق کو "اسلام" اسی لیے کہا

جاتا ہے کہ جو اس دین کو قبول کرتا ہے۔ وہ اپنے کو بالکل اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بنا لیتا ہے۔
چنانچہ اس حدیث میں جن اعمالِ اسلام کا ذکر ہے۔ یعنی عبادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور مفصل حدیث میں کلمہ شہادت اور نماز و روزہ اور حج زکوٰۃ، یہ سب اعمال خدا کی فرماں برداری کے خاص الخاص نشان ہیں۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "ارکانِ اسلام" قرار دیا۔ اور فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پہ ہے۔ (۱) کلمۂ شہادت (۲) نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ (۵) حج۔ ان پانچوں کو ہر مسلمان اچھی طرح جانتا ہے۔ تھوڑی تفصیل ہم بھی یہاں تحریر کر دیتے ہیں۔

کلمۂ شہادت

کلمۂ شہادت کا مفہوم اور مطلب یہ ہے کہ صدق دل سے اللہ کے ایک ہونے اور معبود ہونے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی گواہی دینا۔ اور دل سے مانتے ہوئے زبان سے

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

کہنا۔ اس میں تمام ضروری عقائد اسلام میں داخل ہیں۔ کیونکہ جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دل سے اللہ کا رسول مان کر ان کی رسالت کی گواہی دے دی ہر اُس چیز کی تصدیق کر دی جس کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خدا کی طرف سے لائے۔

نماز

ظہور نبوت کے بارہویں سال شب معراج میں نماز فرض ہوئی۔ نابالغ، مجنون، حیض و نفاس والی عورت کے سوا ہر مسلمان پر نماز فرض عین ہے۔ اور کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھے۔ بیٹھنے کی بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر سر کے اشارے سے پڑھے۔ اس پر بھی قادر نہ ہو تو نماز مؤخر کی جائے گی۔ معاف اس حالت میں بھی نہیں ہوگی۔

نماز کی فرضیت کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ اور جو قصداً ترک کرے اگرچہ ایک ہی وقت کی ہو وہ فاسق ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ نماز چھوڑنے والے کو بادشاہِ اسلام قید کر دے۔ یہاں تک کہ وہ توبہ کرے اور نماز پڑھنے لگے۔

اور حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا فتویٰ ہے کہ تارکِ نماز کو بادشاہِ اسلام قتل کرادے۔

زکوٰۃ و روزہ ۲ھ میں مدینہ منورہ کے اندر ان دونوں کی فرضیت کا حکم نازل ہوا۔ نماز کی طرح زکوٰۃ و روزہ کا انکار کرنے والا بھی کافر ہے اور ان دونوں کو ترک کرنے والا فاسق اور قتل کا مستحق ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے میں دیر لگانے والا گنہگار اور مردود الشہادۃ ہے۔

حج ۹ھ میں حج فرض ہوا۔ صاحبِ استطاعت پر عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے نماز اور روزہ و زکوٰۃ کی طرح حج کی فرضیت بھی قطعی و یقینی ہے۔ لہٰذا جو حج کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر ہے اور باوجود طاقت کے اس کا تارک فاسق ہے اور بلا عذر حج میں تاخیر کرنے والا گناہگار اور مردود الشہادۃ ہے۔

احسان کی حقیقت لغت میں احسان کے معنی "اچھائی" ہیں، چنانچہ اچھا کام احسان کہلاتا ہے اور کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو بھی احسان کہا جاتا ہے اور قرآن و حدیث میں لفظ احسان اس معنی میں بکثرت استعمال بھی ہوا ہے۔ مگر اس حدیث میں جو "احسان" آیا ہے۔ یہ احسان درحقیقت ایمان و اسلام کی طرح دین کا ایک اصلاحی لفظ ہے۔ جس کے معنی کو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ نبوت سے ارشاد فرمایا کہ

" خدا کی عبادت اس طرح کی جائے کہ گویا عبادت کرنے والا خدا کو دیکھ رہا ہے۔"

اس معنی میں احسان کا تعلق صرف نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ مومن کے ہر عمل میں اس کی روح کار فرما ہونی چاہیئے۔ یعنی ہر عمل کے وقت بندہ اس طرح حضورِ قلب، اور اخلاصِ دل کے ساتھ عمل میں مشغول ہو کہ گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اس تصوّر سے عمل کرنے والے بندے کے دل میں خوف و خشیتِ ربّانی، اور امید و رجاء رحمانی کا ایسا نور پیدا ہو جائے گا کہ اس کا عمل انوارِ مقبولیت کی روشنی سے پُر نور اور بندہ سراپا نور بلکہ نورٌ علیٰ نور ہو جائے گا۔ اور رحمتِ کردگار، و فضلِ پروردگار کا دونوں جہان میں مستحق و حق دار بن جائے گا۔

قیامت کی نشانیاں

قیامت کی بہت سی نشانیاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما چکے ہیں جو سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور حدیثوں میں ان کا مفصّل ذکر ہے۔ جن میں سے بہت سی نشانیاں ظاہر بھی ہو چکی ہیں۔ اور جو باقی ہیں وہ بھی یقیناً ظاہر ہو کر رہیں گی۔ مثلاً (۱) دجال کا فتنہ (۲) امام مہدی کا ظہور (۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا (۴) یاجوج ماجوج کا نکلنا (۵) دابۃ الارض کا خروج (۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے کچھ دنوں بعد جب کہ قیامت کے آنے میں صرف چالیس برس باقی رہ جائیں گے تو ایک خوشبودار ٹھنڈی ہوا چلے گی اور وہ لوگوں کی بغلوں کے نیچے سے گزرے گی۔ اس ہوا کے لگتے ہی تمام ایمان والوں کی وفات ہو جائے گی اور روئے زمین پر صرف کفار ہی کفار رہ جائیں گے اور انہی اشرار پر قیامت قائم ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب قیامت کی وہ نشانیاں ہیں۔ جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی ہیں۔ مگر ان سب کا ظہور اتنا ہی یقینی ہے جتنا کہ رات کے بعد دن کا آنا یقینی ہے۔ کیونکہ حضور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب علاماتِ قیامت کے ظاہر ہونے کی خبر دی ہے کیوں؟ اس لیے کہ ؎

ہزار فلسفیوں کی چناں چنیں بدلی
نبی کی بات بدلنی نہ تھی، نہیں بدلی

اس حدیث میں قیامت کی صرف دو نشانیوں کا ذکر ہے۔

اوّل۔ لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔ دوم۔ اونٹوں کے سیاہ فام چرواہے اُونچے اُونچے محلوں میں فخر کریں گے۔

قیامت کی یہ دونوں نشانیاں اُن نشانیوں میں سے ہیں۔ جو اس زمانے میں ظاہر ہو چکی ہیں اور جن کو ہر شخص آج اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

پہلی نشانی کہ "لونڈی اپنے آقا کو جنے گی"۔ شارحین حدیث نے اس کے بہت معانی بیان فرمائے ہیں۔ مگر فقیر راقم الحروف کے نزدیک اس حدیث کا سب سے زیادہ راجح اور واضح مطلب یہی ہے کہ اولاد نافرمان پیدا ہونے لگے گی۔ یعنی لڑکے اپنی ماؤں کے

ساتھ ایسا سلوک کریں گے جیسا سلوک مولیٰ اپنی لونڈی کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ تو گویا ماں نے اپنے لڑکے کو نہیں جنا۔ بلکہ اس کے پیٹ سے اُس کا مولیٰ پیدا ہوا۔ چنانچہ آج کل کی اولاد، ماں باپ کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے۔ وہ بالکل ظاہر ہے۔

دوسری نشانی کہ "سیاہ فام اونٹوں کے چرواہے محلوں میں فخر کریں گے" اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیر و ذلیل پست اقوام کے لوگ جن کو کبھی پھونس کی چھپر بھی میسّر نہیں تھی وہ اونچی اونچی کوٹھیوں اور شاندار بنگلوں میں فخر کریں گے۔

یہ منظر آپ عرب میں بھی دیکھیں گے کہ کالے کالے تکرونی عرب بدوی، جو اونٹوں کے چرواہے تھے۔ آج اپنی اپنی کوٹھیوں میں کس ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ متکبرانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اپنے ملک میں بھی چرواہے، بلکہ ان سے بھی کہیں بدتر لوگ آج اپنے اپنے بنگلوں میں فرعون بنے بیٹھے ہیں اور صورت ایسی جیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ابھی ابھی کوئلوں کی بوری، ڈامر کے پیپے میں سے نکلے ہیں۔

حکومت کی کرسیوں پر براجمان ہونے والے ان نااہلوں کو دیکھ کر مجھے اکثر یہ حدیث یاد آجاتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ تو حضور نے فرمایا کہ جب امانت ضائع کی جانے لگے۔ تو تم قیامت کا انتظار کرو۔ صحابی نے دریافت کیا کہ امانت سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی بربادی کیسے ہوگی؟ تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ " یعنی جب حکومت اور عہدے نااہلوں کے سپرد ہونے لگیں۔ تو تم قیامت کا انتظار کرو۔

قیامت کا علم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کا انکار کرنے والے اس حدیث سے بڑے طنطنے کے ساتھ دلیل لاتے ہیں کہ دیکھ لو۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کا وقت دریافت کیا تو حضور نے یہ جواب دیا کہ "میں سائل سے زیادہ نہیں جانتا" پھر حضور نے سورۂ لقمان کی آیت تلاوت فرما کر صاف طور سے بتا دیا کہ پانچ چیزوں کا علم خدا کی ذات کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔

خدا گواہ ہے کہ مجھے ان فاضلوں کے اس استدلال کو سُن کر انتہائی تعجب ہوتا ہے۔ اللہ اکبر! کتنا بڑا ستم ہے؟ کہ جس حدیث سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قیامت کا علم ثابت ہوتا ہے۔ اسی حدیث کو یہ لوگ حضور کے لیے علمِ قیامت کی نفی پر بطورِ دلیل کے پیش کرتے ہیں۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر واقعی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہی بتانا تھا کہ مجھے قیامت کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ تو اس مفہوم و معنی کو ادا کرنے کے لیے بہت سے الفاظ ہو سکتے تھے۔ مثلاً لَا أَعْلَمُهَا میں اس کو نہیں جانتا۔ "یا لَسْتُ بِعَالِمِهَا" میں اس کا جاننے والا نہیں ہوں۔ یا مَالِی بِذَالِكَ مِن عِلمٍ۔ مجھے اس چیز کا کوئی علم نہیں۔ یا لیس عِلْمُهَا عندی" میرے پاس اس کا علم نہیں ہے۔ یا ان کے ہم معنی کوئی دوسرا جملہ حضور ارشاد فرما دیتے۔

مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جملوں میں سے کوئی یا اس قسم کا کوئی جملہ ارشاد نہیں فرمایا۔ بلکہ سائل کے جواب میں یہ فرمایا کہ "مَا الْمَسْئُولُ بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ" یعنی جس سے قیامت کے بارے میں سوال کیا جا رہا ہے۔ وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔

اس عبارت کا کھلا ہوا، اور صاف صاف مطلب یہی ہوا کہ اے جبریل! میں قیامت کے بارے میں تم سے زیادہ نہیں جانتا۔

عالم تو خیر عالم ہے۔ کسی عربی خواں طالب علم سے بھی اگر آپ اس جملہ کا ترجمہ کرائیں گے تو یقیناً وہ بھی یہی ترجمہ کرے گا۔ جو میں نے لکھا۔ اب آپ ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اور ایمان سے کہیے کہ حضور کے ارشاد "

" میں جبریل سے زیادہ قیامت کو نہیں جانتا"۔

اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہ مطلب ہوا؟ کہ

" قیامت کے بارے میں مجھ کو اور جبریل دونوں کو علم ہے اور میرا علم اس معاملہ میں جبریل سے زیادہ نہیں۔"

یا یہ مطلب ہوا؟ کہ

"میں اور جبریل قیامت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے"

اب آپ انصاف کیجئے کہ اس حدیث سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل علیہ السلام دونوں کو قیامت کے بارے میں علم ہے یا یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور جبریل علیہ السلام دونوں کو قیامت کا علم نہیں ہے۔

واللہ! اگر آپ میں ذرا بھی انصاف کا مادہ ہوگا۔ تو آپ یہی کہیں گے کہ واقعی اس حدیث کا مفہوم یہی ہے کہ۔

"حضور اور جبریل دونوں کو قیامت کا علم ہے"

افسوس! ان لوگوں کو اتنا بھی علم نہیں کہ حضور کے قول "مَا الْمَسْئُوْلُ بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ" میں "اَعْلَمُ" اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اور اسم تفضیل کی نفی سے بالکل ہی فعل کی نفی لازم نہیں ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ زید، عمرو سے زیادہ حسین نہیں ہے تو اس سے کب یہ لازم آتا ہے؟ کہ زید میں بالکل ہی حُسن نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ "بالکل ہی حُسن والا نہ ہونا" یہ اور بات ہے۔ اور "زیادہ حسن والا نہ ہونا" یہ اور بات ہے۔

بہرکیف اس حدیث سے ہرگز ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قیامت کا بالکل ہی علم نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث سے حضور اور حضرت جبریل دونوں کے لیے قیامت کا علم ہونا ثابت ہوتا ہے۔

چنانچہ علامہ شیخ احمد صادی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ احزاب کی آیت وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ کی تفسیر میں تحریر فرمایا۔ فَلَمْ یَخْرُجْ نَبِیُّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الدُّنْیَا حَتّٰی اَطْلَعَهُ اللّٰهُ عَلٰی جَمِیْعِ الْمُغَیَّبَاتِ وَمِنْ جُمْلَتِهَا السَّاعَةُ لٰكِنْ اُمِرَ بِكَتْمِ ذَالِكَ۔ (صادی ج ۳ ص ۲۸۹)

یعنی حضور الصلوٰۃ والسلام دنیا سے اس وقت تک تشریف نہیں لے گئے۔ یہاں

تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام غیوب کے علوم پر مطلع فرما دیا اور انہیں میں سے "قیامت" کا علم بھی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دے دیا تھا کہ "قیامت کب آئے گی" اس علم کو آپ امت سے چھپائیں۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ حضور نے سورۂ لقمان کی آیت تلاوت فرما کر یہ فرما دیا کہ ان پانچوں باتوں کا بجز خدا کے کسی کو علم نہیں۔ اس کا کیا جواب ہے؟

تو اس کے جواب میں ہم یہی عرض کریں گے کہ اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا۔ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پانچوں چیزوں کا علم نہیں تھا۔ کیونکہ اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ ان پانچوں چیزوں کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ کوئی انسان یا جن یا فرشتہ اگر اپنی عقل و فہم سے ان پانچوں چیزوں کو جاننا چاہے تو ہرگز ہرگز نہیں جان سکتا۔

لیکن اگر خداوند عالم کسی کو بتا دے تو یقیناً وہ جان لے گا۔ اس آیت میں یہ کہاں ہے؟ کہ خدا ہی جانتا ہے اور خدا کسی کو ان پانچوں چیزوں کا علم نہیں عطا کرے گا۔ بلکہ اس آیت کے آخر میں اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ کا جملہ تو صاف صاف بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان پانچوں چیزوں کو جانتا ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے ان پانچوں چیزوں کی خبر بھی دے دیتا ہے۔ کیونکہ وہ صرف علیم (علم والا) ہی نہیں ہے۔ بلکہ خبیر (خبر دینے والا) بھی ہے۔

یہ صرف میری ناقص عقل کا "تیر تکہ" نہیں ہے۔ بلکہ بڑے بڑے علم تفسیر و حدیث کے ماہرین فن کی بھی یہی تحقیق ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے مشکوٰۃ شریف کی شرح اشعۃ اللمعات ج ا ص ۴۱ میں اس حدیث کی شرح فرماتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ

مراد یہ ہے کہ ان غیب کی چیزوں کو بغیر اللہ کے بتلائے ہوئے۔ عقل کے اندازے سے کوئی نہیں جان سکتا مگر وہ جس کو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی، یا الہام بتا دے۔ وہ جانتا ہے۔

اسی طرح حضرت علامہ شیخ مُلّا جیون (استاد عالمگیر بادشاہ) نے اسی آیت کی تفسیر میں تحریر فرمایا کہ

اگرچہ ان پانچوں باتوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ عزّوجل اپنے محبوبوں اور ولیوں میں سے جس کو چاہے بتا دے۔ کیونکہ لفظ "خبیر" "مخبر" (خبر دینے والے) کے معنی میں ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

خلاصۂ کلام

الغرض اس حدیث سے ہرگز ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کا علم نہیں تھا۔ بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اے جبریل! میں تم سے زیادہ نہیں جانتا۔ یعنی مجھ کو بھی قیامت کی خبر ہے اور تم کو بھی۔ لیکن مجمع عام میں اس راز کو ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ علم قیامت میرے ان علوم میں سے ہے۔ جن کا عوام سے چھپانا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرض فرمایا ہے۔

بہرکیف حضرت جبریل کے سوال اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جواب سے حاضرین کو صرف اتنا بتانا مقصود تھا کہ قیامت کا علم ذاتی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور ایک مومن کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ وہ قیامت پر ایمان رکھے لیکن قیامت کے آنے کا وقت معلوم کرنا یہ مومن کے لیے نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی کسی مومن کو اس کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کا علم بغیر خُدا کے بتائے کسی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

(علم قیامت کی پوری بحث ہماری کتاب "قرآنی تقریریں" میں پڑھ لیجئے)۔

مسائلِ حدیث

اس حدیث "اُمُّ الاحادیث" سے بہت سے مسائل پر روشنی پڑتی ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) فرشتے انسانی شکل وصورت میں آ سکتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے پڑھا کہ حضرت جبرئیل بارگاہ نبوّت میں ایک آدمی کی شکل میں تشریف لائے۔

(۲) کسی شخص سے کسی بات کے متعلق سوال کرنا یہ سائل کی لاعلمی کی دلیل نہیں ہے دیکھئے۔ حضرت جبریل نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے چند باتوں کا سوال کیا۔ حالانکہ

حضرت جبریل ان باتوں کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ مگر جاننے کے باوجود حضور سے سوال کیا۔ تاکہ لوگ زبانِ رسالت سے اس کا جواب سُن کر دین کا علم حاصل کریں۔

علماء دیوبند کا بار بار یہ کہنا کہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فلاں بات کا علم ہوتا تو کیوں لوگوں سے دریافت کرتے؟ یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ یاد رکھیے کہ سوال کے بہت سے مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سوال صرف اُسی بات کا کیا جائے جو معلوم نہ ہو۔ آخر امتحان لینے والے بھی تو طالب علموں سے سوالات کرتے ہیں۔ تو کون عقل مند یہ کہہ سکتا ہے؟ اگر ممتحن صاحب کو یہ باتیں معلوم ہوتیں تو وہ طلبہ سے کیوں پوچھتے؟

(۳) اگر کسی سوال کا جواب ایسا ہو جو عام سامعین کی عقل وفہم سے بالا ہو، یا اس جواب کو عوام سے چھپانے میں کوئی مصلحت ہو۔ تو عالموں پر یہ ضروری نہیں ہے کہ مجمع عام میں اس کا جواب دیں۔ دیکھ لیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کا علم تھا مگر چونکہ حضور پر منجانب اللہ فرض تھا کہ قیامت کا علم کسی پر ظاہر نہ فرمائیں اس لیے حضور نے حضرت جبریل کو واضح طور پر اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیونکہ عوام اس علم کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شربت ہاتھی کے لیے تیار کیا گیا ہے وہ بھلا ایک چیونٹی کو کس طرح اور کیونکہ پلایا جاسکتا ہے؟

ہر سخن نکتہ وہر نکتہ مقامے دارد

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

درختِ ایمان کی شاخیں

حدیث نمبر ۳

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَۃً وَّالْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ ۔

(بخاری شریف ج ا کتاب الایمان ص۶)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی شاخیں ساٹھ سے کچھ زیادہ ہیں اور "حیا" ایمان کی ایک بہت بڑی شاخ ہے ۔

اس حدیث کو امام بخاری کے علاوہ مسلم، النسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں تحریر فرمایا ہے۔

توضیح الفاظ بِضْعٌ کا لفظ گنتی میں تین سے لے کر نو تک کے عدد پر بولا جاتا ہے شُعْبَۃٌ شاخ کو کہتے ہیں۔ حَیَاءٌ کا ترجمہ "شرم" ہے جس کو ہندی میں "لاج" بھی کہتے ہیں۔ حضرت علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ حیاء کی تفسیر فرماتے ہوئے تحریر فرمایا کہ اَلْحَیَاءُ انقباض النَّفْسِ عَنِ الْقَبِیْحِ مَخَافَۃَ الذَّمِ (بیضاوی شریف) یعنی مذمت کا خوف کرتے ہوئے برے کاموں سے نفس کا سکڑ جانا۔ اس کیفیت کا نام "حیا" ہے۔

یہ درحقیقت "وقاحت" اور "خجالت" کے درمیان کی ایک صفت ہے۔ "وقاحت" یہ ہے کہ انسان اس قدر بے شرم و بے غیرت بن جائے کہ اس کو کسی برے سے برے کام کرنے سے بھی کوئی جھجک ہی نہ ہو۔ اور "خجالت" یہ ہے کہ انسان اتنا شرمیلا ہو جائے

کہ اچھے اور بُرے کام سے جھجکنے لگے اور "حیا" یہ ہے کہ بُرے کاموں سے خیال کر کے جھجک ہو کہ لوگ مذمت کریں گے اور اچھے کاموں سے کوئی جھجک نہ ہو۔

وقاحت اور خجالت یہ دونوں انسان کے مذموم اور بُری صفتیں ہیں۔ اور حیا انسان کی انتہائی محمود اور پسندیدہ صفت ہے۔

شرح حدیث

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کو ایک ایسے درخت سے تشبیہہ دی ہے جس میں چھوٹی بڑی بہت سی ٹہنیاں اور شاخیں ہوں۔ جن کی وجہ سے وہ درخت ہرا بھرا، سایہ دار انتہائی خوشنما اور نہایت ہی حسین وخوبصورت نظر آتا ہے۔ یہی مثال ایمان کی ہے کہ ایمان کی چھوٹی بڑی بہت سی خصلتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے ایمان کی رونق اور خوبی میں چار چاند لگ جاتا ہے اور اس کے اثرات وثمرات کی بدولت صاحبِ ایمان کی زندگی دونوں جہان میں حُسن وجمال کا ایک ایسا جاذب نظر مرقع بن جاتی ہے کہ وہ تمام مخلوق کی نگاہوں میں صاحبِ وقار اور قابلِ اعتبار ہو جاتا ہے اور دربارِ خداوندی میں عظمتِ دارین کا حقدار بن جاتا ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا کہ ایمان کی کچھ اُوپر ساٹھ شاخیں یعنی خصلتیں ہیں۔ اور حیاء ایمان کی ایک نہایت ہی اہم اور بہت بڑی شاخ یعنی خصلت ہے۔

اب غور فرمایئے کہ وہ خوشنما اور بارونق درخت جو اپنی بہت سی ٹہنیوں اور شاخوں کی وجہ سے انتہائی خوبصورت نظر آتا ہے اگر اس کی تمام شاخوں کو کاٹ ڈالا جائے اور صرف اُس درخت کے تنہ کا "ٹھنٹھ" باقی رہ جائے۔ تو پھر ظاہر ہے کہ وہ اب درخت کہلانے ہی کا مستحق نہیں رہے گا۔ بھلا کون ہے جو صرف تنہ کے "ٹھنٹھ" کو درخت کہے گا؟ جس میں نہ ڈالیاں ہوں نہ ٹہنیاں نہ شاخیں ہوں نہ پتیاں!

اسی طرح اگر درخت کی کچھ شاخوں کو کاٹ کر درخت کو ننگا کر دیا جائے۔ تو یقیناً درخت کی حسین وخوبصورت چھتری کا حُسن وجمال تہس نہس ہو جائے گا اور اُس کا

سایہ بھی کم ہو جائے گا اور اس کے پھل پھول میں بھی نمایاں کمی ہو جائے گی اور اگر درخت کی کوئی اتنی بڑی ڈالی کاٹ ڈالی جائے جس میں بہت سی ٹہنیاں اور شاخیں ہوں اور وہ ڈال درخت کی نشو و نما اور اس کی سرسبزی و شادابی میں ممدّ و معاون رہی ہو۔ تو پھر اندیشہ ہے کہ شاید پورا درخت ہی خشک ہو کر آگ کا ایندھن بن جائے۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان کی بھی چھوٹی بڑی بہت سی خصلتیں ہیں کہ اگر ان تمام خصلتوں کا وجود ختم ہو جائے۔ تو گویا ایمان ہی کا خاتمہ ہو جائے گا اور اگر کچھ خصلتیں معدوم ہو گئیں۔ تو جتنی خصلتیں اور جتنی جتنی اہم خصلتیں ناپید ہوتی چلی جائیں گی۔ اسی قدر ایمان کا نور، اُس کی رونق، اس کا حُسن و جمال کم سے کم تر ہوتا چلا جائے گا اور اگر کوئی ایسی اہم سے اہم تر اور خاص الخاص خصلت برباد ہو گئی جو ایمان کا نشان، بلکہ شانِ ایمان کہلانے کی مستحق تھی تو پھر تو انتہائی خطرہ ہے کہ کہیں ایمان ہی برباد نہ ہو جائے چنانچہ ایسی ہی ایک نہایت ہی اہم خصلتِ ایمان کو بیان فرماتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "الحیاء شعبۃ من الایمان" یعنی حیاء ایمان کی ایک بہت ہی بڑی شاخ یعنی خصلت ہے۔

حیاء بڑی شاخ کیوں ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ آخر "حیاء" ایمان کی بہت بڑی شاخ اور بہت اہم خصلت کیونکر؟ اور کس طرح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پورے خصائلِ ایمان اور اعمالِ اسلام دو ہی قسموں میں منحصر ہیں "اوامر" اور "نواہی" یعنی اچھا کام کرو۔ اور بُرا کام مت کرو اور ظاہر ہے کہ جس مسلمان میں حیاء کی صفت ہوگی۔ وہ تمام بُرے کاموں سے فطری طور پر رُک جائیگا اور تمام نواہی سے باز رہے گا۔ تو ایک صفتِ حیاء کی وجہ سے مسلمان تمام شرعی ممنوعات سے بچ جائے گا۔ تو گویا حیاء ایمان کی ایک ایسی خصلت ہوئی کہ اس کی وجہ سے بہت سی ایمانی خصلتیں پائی جائیں گی۔ اسی لیے بلاشبہ یہ درختِ ایمان کی شاخوں میں سے نہایت ہی اہم اور بہت ہی بڑی شاخ ہے۔

ساٹھ یا ستّر

واضح رہے کہ بخاری شریف کی اس روایت میں تو ایمان کی شاخوں کو ساٹھ سے کچھ زائد بتایا گیا ہے۔ مگر دوسری روایتوں میں بضع وسبعون" کا لفظ آیا ہے۔ یعنی ایمان کی شاخیں ستّر سے کچھ زیادہ ہیں بظاہر ان دونوں حدیثوں میں تعارض نظر آتا ہے۔ مگر درحقیقت کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ قلیل، کثیر میں داخل ہوتا ہے۔ اس لیے جب ایمان کی شاخیں ستّر سے اوپر ہوئیں تو پھر ساٹھ سے اُوپر بھی ہوئیں۔ اس لیے کسی روایت میں ساٹھ سے زائد کہہ دیا گیا۔ اور کسی روایت میں ستّر سے اُوپر کہہ دیا گیا۔

اور بعض شارحین حدیث نے دونوں حدیثوں میں تعارض دفع کرنے کے لیے یہ فرمایا کہ ساٹھ سے اُوپر، یا ستّر سے زائد جو فرمایا گیا۔ تو ان دونوں گنتیوں سے تعیین و تحدید مُراد نہیں ہے۔ بلکہ تکثیر مُراد ہے۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خصائل ایمان گنتی میں ساٹھ سے کچھ زیادہ ہی ہیں یا ستّر سے اوپر ہی ہیں۔ بلکہ ان دونوں گنتیوں سے مُراد یہ ہے کہ ایمان کی خصلتیں بہت زیادہ ہیں۔ جیسے ہمارے اردو کے محاورہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ "میں نے پچاس مرتبہ تم کو حکم دیا" اور ستّر مرتبہ تم کو منع کیا" تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے گن کر پچاس مرتبہ تم کو حکم دیا۔ اور گن کر ستّر مرتبہ تم کو منع کیا۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں نے بہت مرتبہ تم کو حکم دیا اور بہت مرتبہ تم کو منع کیا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ تعارض کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اب رہا یہ سوال کہ ایمان کی شاخیں یعنی خصلتیں کون کون ہیں؟ تو علامہ عینی وغیرہ نے ان کی تعداد ستہتّر تحریر کی ہے۔ جن کا تذکرہ طوالت سے خالی نہیں۔ مگر خلاصہ یہ ہے کہ تمام احکام اسلام خواہ وہ اعتقادی ہوں یا قولی وفعلی، مثلاً کلمۂ شہادت، نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ، حقوق اللہ، حقوق العباد، یہ سب کے سب درختِ ایمان کی شاخیں اور ایمانی خصلتیں ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک ایمان کے اثرات و ثمرات ہیں۔ جن سے درختِ ایمان کا حُسن و جمال بڑھتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کو ترک کر دینے سے ایمان کا درخت اپنی خوشنما اور بارونق

خوبصورتی اور شادابی سے محروم ہو جاتا ہے۔

فوائد و مسائل

(۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان درجات و مراتب میں برابر نہیں ہے۔ بلکہ جس مسلمان میں ایمانی خصائل زیادہ سے زیادہ ہوں گی وہ یقیناً اُس مسلمان سے مراتب و درجات میں افضل و اعلیٰ ہوگا۔ جس میں ایمان کی خصلتیں کم ہوں گی۔

(۲) ایمان اصل ہے اور اعمال اس کی فرع ہیں۔ اسی لیے کہ اس حدیث میں یا دوسری حدیثوں میں جہاں جہاں بھی اعمال کو ایمان کہا گیا ہے۔ مجاز کے طور پر کہا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اعمال ایمان کا جزو نہیں ہیں۔ کیونکہ قرآن و حدیث میں بے شمار جگہوں پر "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا لفظ آیا ہے اور عمل کا ایمان پر عطف کیا گیا ہے اور عطف کا تقاضا یہی ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں تغایُر ہو۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ عمل اور چیز ہے اور ایمان اور چیز ہے۔ ایمان اصل ہے۔ اور اعمال ایمان کی خصلتیں اور علامتیں ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ اعمال ایمان کے اثرات و ثمرات ہیں۔

(۳) اس حدیث نے اس حقیقت کی تصریح کر دی کہ "حیا" مومن کی بڑی ہی انمول، اور نہایت ہی گرانقدر صفت ہے۔ اس لیے جس مومن میں حیاء نہ ہو۔ تو سمجھ لو کہ اس کے درختِ ایمان کی بہت ہی بڑی شاخ کٹ گئی ہے۔ اسی لیے عرب کی ایک بہت پرانی مثل ہے جس پر تصدیق نبوت کی بھی مہر لگی ہوئی ہے کہ اِذَا لَمْ تَسْتَحِیِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ، جس کا فارسی میں ترجمہ ہے کہ "بے حیا باش ہرچہ خواہی کن" یعنی جب تمہارے اندر حیا ہی نہیں رہی تو پھر جو چاہو کرو۔

کون مُسلمان افضل ہے؟

حدیث نمبر ۴

عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ
اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ
مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔

(بخاری ج ا کتاب الایمان صہ ۶)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ تو ارشاد فرمایا کہ اس شخص کا اسلام جس کی زبان اور ہاتھ سے تمام مُسلمان سلامت رہیں۔

حضرت ابوموسیٰ

اس حدیث کے راوی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت ہی نامور صحابی ہیں۔ یمن کے قبیلۂ اَشعرُ سے آپ کا تعلق ہے۔ اس لیے اشعری کہلاتے ہیں۔ آپنے مکۃ مکرمہ میں اسلام قبول کیا اور پہلے مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ پھر حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "زبید" و "عدن" ساحلِ یمن کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو "کوفہ و بصری" کا گورنر بنایا۔ آپ سے کل تین سو ساٹھ حدیثیں مروی ہیں۔ صحابہ اور تابعین کی بہت بڑی تعداد آپ کے شاگردوں کی فہرست میں ہے۔ خاص کر آپ کے صاحبزادگان ابو بردہ، ابوبکر، ابراہیم، موسیٰ نے آپ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

بخاری شریف میں آپ کی روایتوں کی تعداد چوّن ہے (فیوض الباری ص۱۱۵) مگر علامہ قسطلانی کا بیان ہے کہ بخاری شریف میں ستاون حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔

(ارشاد الساری ج۱ ص۲۱۶)

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں کہ آپ نے ۴۱ھ یا ۴۴ھ یا ۴۵ھ میں بمقام کوفہ وفات پائی۔

مگر اکمال فی اسماء الرجال میں تحریر ہے کہ ۵۲ھ میں مکہ مکرمہ کے اندر آپ کی رحلت ہوئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

شرح حدیث

اس حدیث کو مسلم اور نسائی نے کتاب الایمان میں اور ترمذی نے کتاب الزہد میں ذکر کیا ہے۔ مسلم شریف میں اسی مضمون کی جو دوسری روایت درج ہے اس میں " اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ " کی جگہ " اَیُّ الْمُسْلِمِیْنَ اَفْضَلُ " کا لفظ آیا ہے۔ بہر حال اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں افضل وہ مسلمان ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے تمام مسلمان سلامت رہیں۔ نہ وہ کسی مسلمان کو اپنی زبان سے کوئی ایذا پہنچائے۔ نہ اپنے ہاتھ سے کسی مسلمان کو کوئی تکلیف دے۔

فوائد و مسائل

ایذا اور تکلیف تو زبان اور ہاتھ کے علاوہ دوسرے اعضاء سے بھی پہنچائی جا سکتی ہے اور کسی بھی عضو سے کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچانا حرام ہے۔ مگر اس حدیث میں خصوصیت کے ساتھ زبان اور ہاتھ کا ذکر اس لیے ہے کہ انسان کے زیادہ تر اعمال وافعال زبان اور ہاتھ ہی سے انجام پاتے ہیں اور حدیث میں ان دونوں اعضاء میں سے زبان کا ذکر پہلے۔ اور ہاتھ کا ذکر بعد میں اس لیے کیا گیا کہ ایذا پہنچانے کے معاملہ میں زبان کا نمبر ہاتھ سے بھی آگے ہے۔ کیونکہ اوّلاً تو زبان سے تکلیف پہنچانا بہت ہی کثیر الوقوع اور آسان ہے۔ کون نہیں جانتا کہ انسان اپنی گالیوں، افترا پردازیوں، بدگوئیوں، غیبتوں، چغلیوں سے، اور زبان سے ظلم اور ناانصافی کے احکام دے کر ایک منٹ میں سینکڑوں ایذائیں اور تکلیفیں

پہنچا دیتا ہے۔ پھر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زبان کی ایذائیں اور تکلیفیں، ہاتھ اور دوسرے اعضاء کی تکلیفوں سے بدرجہا بڑھ کر دکھ دینے والی ہوا کرتی ہیں۔ کسی عربی شاعر نے اس بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ ؎

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

یعنی برچھیوں اور بھالوں کے زخم تو بھر کر اچھے ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر زبان کے لگائے ہوئے زخم کبھی نہیں بھرا کرتے۔ بلکہ وہ ہمیشہ تازہ ہی رہتے ہیں۔

پھر زبان کی ایذا اور تکلیف ایسی ہے کہ دور والے اور نزدیک والے سب کو پہنچائی جاسکتی ہے۔ برخلاف ہاتھ پاؤں وغیر اعضاء کے کہ ان سے صرف اسی کو تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے جو قریب ہو۔

بہرکیف ارشادِ نبوی کا مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان کسی طرح کسی مسلمان کو تکلیف اور ایذا نہ پہنچائے اس مسلمان کا اسلام ان مسلمانوں سے افضل و اعلیٰ ہے جو ایذا پہنچاتے اور دکھ دیتے رہتے ہیں۔

۲: یہ حدیث "جوامع الکلم" میں سے ہے۔ یعنی اس کے مختصر الفاظ میں معانی و مضامین اور احکام و فرامین کا ایک سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اگر مسلمان صرف اس ایک حدیث پر صحیح معنوں میں عمل کر لیں تو پھر حقوق العباد کے تمام جزئیات پر عمل کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔ آج کل ہر طرف ظلم، خیانت، چوری، ڈاکہ زنی، بدکاری، چور بازاری، سود خواری، بدعہدی، بددیانتی، غیبت، چغلی، تہمت، گالیاں، قتل و خونریزی وغیرہ ہزاروں خرابیاں مسلم معاشرہ میں داخل ہو کر پوری قومِ مسلم کی ایذا رسانی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ جس سے ملتِ اسلامیہ کا نظامِ عمل اس طرح تہس نہس ہو کر تباہ و برباد ہو گیا ہے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو مسلمانوں ہی سے دکھ اور تکلیف نہ پا رہا ہو اور کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو حقوق العباد کے مواخذوں میں گرفتار نہ ہو۔

اگر اس فرمانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمان اپنے لیے حرزِ جان اور اپنے اعمال و

افعال کا رہنما نشان بنالیں۔ تو بجذایہ ایک ہی حدیث پوری ملتِ اسلامیہ کے امن و چین کی ضامن ہے۔ کیونکہ جب ہر مسلمان اپنی زندگی کا یہ دستور بنالے گا کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میری کسی حرکت سے کسی مسلمان کو کوئی نقصان اور دُکھ درد نہ پہنچے۔ تو ظاہر ہے کہ مسلم معاشرہ امن و امان اور راحت و عافیت کا گہوارہ بن جائے۔ نہ تھانہ پولیس کی ضرورت رہے گی۔ نہ کچہریوں میں دادرسی اور فریاد رسی کی کوئی حاجت باقی رہے گی۔

مگر کس قدر افسوسناک سانحہ ہے کہ مسلمان اپنی قومی بیماریوں کا علاج حکومت کے ایوانوں اور کفار و مشرکین کے قوانین، سیاسی پارٹیوں کے دفتروں یا کمیونزم و سوشلزم کے دارالامراض میں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور مدینہ والے "دارالشفاء" کے ان تیر بہدف نسخوں اور تریاقوں کو ایسے بھولے بیٹھے ہیں کہ کبھی بھول کر بھی ان کو یاد نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا کی قسم رحمتِ عالم ہی کی وہ ذاتِ گرامی ہے جس کے بارے میں پورے عزم و یقین اور وثوق و اعتماد کے ساتھ بہ بانگِ دُہل یہ کہا جا سکتا ہے کہ،

وہ حاذق، جس کا تنہا نسخہ، تنزیلِ فرقانی
دوائے جملہ علتہائے جسمانی و روحانی

مومن کامل

حدیث نمبر ۵

عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔

(بخاری ج ا کتاب الایمان صہ ۶)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی مومن (کامل) نہیں ہوگا۔ جب تک کہ اپنے بھائی (مومن) کے لیے وہی چیز نہ پسند کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے۔

حضرت انس بن مالک

اس حدیث کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بہت ہی جلیل القدر اور صاحب فضیلت صحابی ہیں۔ ان کی کنیت "ابوحمزہ" ہے اور یہ مدینہ منورہ کے باشندہ انصاری ہیں۔ دس برس کی عمر سے بارگاہِ نبوت میں خادم خاص کی حیثیت سے رہے اور دس برس تک مسلسل سفر و حضر میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے خوش ہو کر ان کے لیے عمر، مال، اولاد میں برکت کی دُعا فرمائی۔ اسی کا مبارک اثر تھا کہ ان کا باغ سال میں دو مرتبہ پھلتا تھا اور باغ کے تمام پھلوں میں مشک کی خوشبو آتی تھی۔ چند بیویوں اور باندیوں کے شکم سے ان کے ایک سو بیٹے ہوئے۔ سو برس کی عمر پائی۔ ۹۳ھ میں "بصرہ" کے اندر آپ کی وفات ہوئی۔ مشہور باکرامت محدث حضرت محمد بن سیرین نے آپ کو غسل دیا اور بصرہ میں حجاج بن یوسف گورنر کے محل کے قریب میں آپ مدفون ہوئے۔

آپ سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں۔ صرف "صحاح ستّہ" میں دو ہزار دو سو چھیاسی حدیثیں آپ کی روایت کی ہوئی مذکور ہیں اور بخاری شریف میں آپ کی مرویات کی تعداد دو سو اکیاون ہے۔ (فیوض الباری ج ا ص ۱۲۴) مگر علامہ قسطلانی نے تحریر فرمایا ہے کہ بخاری شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی ہوئی دو سو اڑسٹھ حدیثیں ہیں (ارشاد الساری ج ا ص ۲۱۸) واللہ تعالیٰ اعلم۔

شرح حدیث

یہ حدیث درحقیقت اس سے پہلے والی حدیث کا تتمہ اور تکملہ ہے اور سلسلۂ حقوق العباد کی دوسری کڑی ہے۔ پہلی کڑی تو یہ تھی کہ ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کا یہ دستور بنالے کہ میری ذات سے کسی مسلمان کو کسی طرح کوئی ایذا نہ پہنچے اور دوسری کڑی یہ ہے کہ مسلمان اس زریں اصول کو اپنا ضابطہ حیات بنالے۔ کہ جو کچھ اور جیسے سلوک و معاملات کو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی دوسرے مسلمان کے لیے بھی پسند کرے۔ مثلاً ہر شخص اپنی ذات کے لیے یہ پسند کرتا ہے کہ کوئی مجھ کو نقصان نہ پہنچائے۔ کوئی میری بے آبروئی نہ کرے۔ کوئی میرے ساتھ بدسلوکی اور بدمعاملگی نہ کرے۔ کوئی مجھے دھوکہ اور فریب نہ دے۔ کوئی مجھ کو اور میرے رشتہ داروں اور محبت والوں کو نہ ستائے۔ یوں ہی ہر شخص اپنے لیے یہ پسند کرتا ہے کہ مجھے عزّت و آبرو مال و دولت اور تندرستی و سلامتی ملے۔ میری ہر چیز اچھی ہو۔ میری زندگی اچھی گزرے۔ مجھے ہر طرح کا آرام و راحت ملے وغیرہ وغیرہ

اب اس حدیث کی روشنی میں ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے جو کچھ اور جن جن چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ وہی ہر مسلمان کے لیے بھی پسند کرے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی مسلمان اس طرزِ فکر اور اس طریقہ کو اپنی زندگی کا دستورِ حیات بنالے گا۔ تو پھر وہ کسی مسلمان کی کبھی بھی کوئی حق تلفی نہیں کرے گا اور وہ حرص و حسد، بغض و کینہ، نفاق و شقاق، جنگ و جدال، کشت و قتال وغیرہ تمام اخلاق رزیلہ سے آئینہ کی طرح صاف شفاف ہو جائے گا۔ اور مسلم معاشرے آرام و راحت اور امن و چین کی ایک جنّت بن کر ساری دُنیا کے لیے باعثِ کشش، اور تمام اقوام عالم کے لیے جاذبِ نظر بن جائے گا۔

اور امن کی متلاشی اور سکون و اطمینان کی بھوکی پیاسی دنیا کو اسلامی معاشرہ کے دامنِ رحمت میں پناہ ملے گی اور پھر ہم مسلمان اس منزل میں ہوں گے کہ علی الاعلان ساری دنیا میں یہ اعلان نشر کر سکیں گے کہ ۔

کہہ دو یہ ایٹم و سائنس کے متوالوں سے — تھام لو دامنِ حق، اب بھی سنبھل جاؤ گے
گر کیا تم نے محمد کی اطاعت سے گریز — اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جل جاؤ گے

فوائد و مسائل

(۱) اس حدیث کو امام مسلم، ترمذی، نسائی نے اپنی اپنی کتابوں کے کتاب الایمان میں نقل فرمایا ہے ۔

۲ : اس حدیث میں " لا یؤمن " کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک کوئی مومن ہوگا ہی نہیں ۔ جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے ۔ مگر اس بات پر تمام شارحینِ حدیث کا اتفاق ہے کہ اس حدیث میں لفظ " کاملاً " یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ پوشیدہ ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی کامل و مکمل مسلمان نہیں ہوگا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے وہی سب کچھ نہ پسند کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے ۔ اس حدیث میں لفظ " کاملاً " پوشیدہ ماننا ضروری ہے ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر کسی مسلمان میں یہ وصف نہ پایا جائے تو ہرگز ہرگز وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا ۔ اس خوبی کے نہ رہنے کی صورت میں بھی اگر کوئی شخص تمام ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتا ہے تو وہ مسلمان ہی کہلائے گا ۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اسلام کی خوبیوں میں کچھ نقصان رہے گا اور وہ حسنِ اسلام کے کمال سے محروم رہے گا ۔ لہٰذا کامل و مکمل درجے کا مسلمان نہیں کہلائیگا ۔

ایک ضروری انتباہ

یہاں ایک بات خصوصاً حدیث پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لیے بہت ہی خاص طور پر قابل توجہ ہے ۔ وہ یہ ہے کہ اکثر حدیثوں میں کسی ایک کام کو اسلام کا نشان قرار دے دیا گیا ہے ۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ " مسلمان وہ ہے کہ تمام مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے سلامت رہیں " اور ایک حدیث میں یہ وارد ہوا کہ " بہترین اسلام اس شخص کا ہے جو کھانا کھلائے اور سلام

سلام کرے۔" تو ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس مسلمان میں ایذا سے بچنے یا کھانا کھلانے، یا سلام کرنے کی صفت پائی گئی وہ صرف اس ایک صفت کی وجہ سے مسلمان کامل ہو گیا۔ اگرچہ وہ دوسرے اعمال وارکانِ اسلام کی پابندی نہ کرتا ہو۔ اسی طرح ان حدیثوں کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ بس یہی ایک اسلامی کام ضروری ہے اور باقی دوسرے اعمالِ اسلام غیر ضروری ہیں۔ معاذ اللہ! ان حدیثوں کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک کام کو خاص طور پر نشانِ اسلام اور علامتِ ایمان فرما دینے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس عمل کی کسی خاص اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت ظاہر فرمانا چاہتے ہیں مثلاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک حدیث میں یہ فرمایا" لَا صَلوٰۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ" نہیں ہے۔ کوئی نماز مگر حضورِ قلب سے۔ تو اس حدیث کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ بس حضورِ قلب ہی نماز کے درست ہونے کے لیے سب کچھ ہے۔ شرائط اور ارکان نماز کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نماز میں حضورِ قلب کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور حالتِ نماز میں دل کی حضوری ایک بہت ہی اہم صفت ہے۔

اسی طرح وہ حدیثیں جن میں چند خاص خاص گناہوں کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ جو ان گناہوں کو کرے وہ مومن نہیں یا خاص خاص اعمال صالحہ کے بارے میں یہ ارشاد ہوا کہ جو شخص ان اعمال کو چھوڑ دے وہ مومن نہیں۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ ان حدیثوں کا ہرگز ہرگز یہ منشا اور مقصد نہیں ہے کہ وہ شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو کر کافر ہو گیا۔ بلکہ ان سب حدیثوں کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ان گناہوں کا کرنے والا اور ان اعمالِ صالحہ کا چھوڑنے والا کامل درجے کا مسلمان نہیں ہے اور ایک مومنِ کامل کے اعلیٰ درجات اور بلند مقام سے محروم ہے۔

یہ خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ان حدیثوں کا مقصد قانونِ شرعی بیان کرنا

یا کفر کا فتوے دینا نہیں ہے۔ بلکہ ان حدیثوں کا مقصد بُرے کاموں کی برائیوں کو بہت شدید بتا کر شدت کے ساتھ اس سے مسلمانوں کو روکنا اور اچھے کاموں کی اچھائی کو بہت زیادہ اچھا بتا کر اس کام پر مسلمانوں کو رغبت دلانا ہے۔

درحقیقت کلامِ نبوت کے طرزِ خطاب کی خصوصیات سے ناواقفیت، اور ان حدیثوں کے اصل مفہوم سے بے خبری ہی کا نتیجہ ہے کہ فرقۂ معتزلہ اور خوارج نے ان حدیثوں کے ظاہری معنی مُراد لے کر گناہگار مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ دے دیا اور خود گمراہی کے انتہائی گہرے غار میں گر پڑے۔ اسی طرح اس زمانے کے بعض جاہل مبلغ جو حدیثوں کا صرف ترجمہ پڑھ پڑھ کر تبلیغ کرنے لگے ہیں۔ وہ بھی اپنی جہالت سے ان حدیثوں کا یہی مطلب بتاتے پھرتے ہیں۔ مثلاً "تارکِ نماز مسلمان ہی نہیں"۔ "جس میں عہد و امانت کی پابندی نہ ہو وہ مسلمان ہی نہیں"۔ حالانکہ حدیث کا یہ مطلب بالکل ہی غلط ہے کیونکہ تارکِ نماز یقیناً مسلمان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کامل درجے کا مسلمان نہیں۔ اسی طرح عہد و امانت کی پابندی نہ کرنے والا اگرچہ گناہگار ہے مگر بلاشبہ وہ مسلمان ہے۔

بہرکیف علماء اہلسنت کا فرض ہے کہ وہ جب اس قسم کی حدیثوں کو بیان فرمائیں تو ان کی حقیقی پوزیشن کو تفصیل کے ساتھ ضرور واضح کر دیں۔ تاکہ خالی الذہن عوام گمراہی کا شکار نہ ہوں اور عوام کا فرض ہے کہ وہ جاہل مبلغوں کو ہرگز ہرگز منبر رسول پر نہ آنے دیں اور کبھی بھی ان کا وعظ نہ سنیں۔ ورنہ بہت بڑا خطرہ ہے کہ ان جاہلوں کی زبان سے حدیثوں کا غلط مطلب سُن کر کہیں سامعین کا عقیدہ خراب، اور ان کا ایمان برباد نہ ہو جائے۔ والمولیٰ تعالیٰ ھو الموفق! ؎

من انچہ شرطِ ابلاغ است باتو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

علاماتِ نفاق

حدیث نمبر ۶

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔

(بخاری ج ۱ باب علامۃ المنافق ص ۱۰)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص میں یہ چار باتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہے اور جس شخص میں ان چار باتوں میں سے ایک بات ہوگی۔ اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے (۱) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۳) اور جب کسی سے کوئی عہد کرے تو عہد شکنی کرے (۴) اور جب جھگڑا کرے تو بدزبانی کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو

اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ خاندان قریش کی شاخ بنی سہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے سہمی قریشی کہلاتے ہیں۔ بہت ہی صاحبِ مرتبہ صحابی ہیں۔ عالم، حافظِ قرآن، بہت بڑے عابد و زاہد تھے۔ اپنے باپ حضرت عمرو بن العاص سے پہلے ایمان لائے اور ہجرت بھی کی۔ راتوں کو خوفِ الٰہی سے روتے روتے ان کی آنکھوں میں آشوبِ چشم ہوگیا تھا۔ جس کے لیے ان کی والدہ سُرمہ بنایا کرتی تھیں۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کو لکھنے کی اجازت طلب

کی تھیں۔ تو حالانکہ عام طور پر حضور نے لوگوں کو حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا تھا اور صرف قرآن کے لکھنے کا حکم دیا تھا تاکہ قرآن و حدیث میں خلط ملط نہ ہونے پائے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حدیثیں لکھنے کی اجازت عطا فرمادی تھی۔ کیونکہ ان کی احتیاط پر حضور کو پورا پورا اعتماد تھا۔ کہ یہ آیتوں اور حدیثوں کو خلط ملط نہیں ہونے دیں گے۔ علم حدیث میں ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اتنے نامور اور مشہور صحابی کی تاریخ وفات اور ان کی قبر شریف کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ بعض کا اقوال ہے کہ ۶۳ھ میں بعض کا اقوال ہے کہ ۷۳ھ میں مکہ مکرمہ کے اندر آپ کا وصال ہوا اور بعض نے کہا کہ ۵۵ھ میں طائف کے اندر آپ کی وفات ہوئی اور بعض یہ کہتے ہیں کہ مصر میں ۶۵ھ کے سال آپ کا انتقال ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (اکمال وارشاد الساری ج ا صہ ۲۵۱)

شرح حدیث

منافق کی دو قسمیں ہیں۔ (منافقِ اعتقادی اور منافقِ عملی)

منافق اعتقادی وہ ہے کہ زبان سے تو اسلام کا اظہار کرتا ہو۔ مگر اپنے دل میں کفر چھپائے ہوئے ہو۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عبداللہ بن ابی وغیرہ منافقوں کی ایک جماعت تھی کہ یہ لوگ بظاہر کلمہ پڑھتے تھے۔ روزہ و نماز اور حج و زکوٰۃ کے بھی پابند تھے مگر دل سے اسلام کے منکر تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ایمان و عقیدہ میں ہی نفاق تھا۔ منافق اعتقادی کافر ہے بلکہ کافر سے بھی بدتر ہے۔ قرآن کریم کا فرمان ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ یعنی منافق اعتقادی کو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ڈال دیا جائے گا۔

منافق عملی وہ ہے کہ جس کے ایمان و عقائد میں کوئی خرابی و نفاق نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ظاہر و باطن میں مسلمان ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعض اعمال اور خصلتیں منافقوں سے ملتی جلتی ہیں۔

اس حدیث میں جس منافق کی چار خصلتوں کا ذکر ہے۔ اس منافق سے مراد منافق عملی ہے اور چاروں منافقانہ خصلتوں سے مراد منافقانہ اعمال و کردار ہیں اور وہ چاروں خصلتیں یہ ہیں:

(۱) جب اس کو کوئی امانت سونپی جائے تو اس میں خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۳) جب کسی سے کوئی عہد کرے تو دغا کرے (۴) جب کسی سے کسی معلہ میں جھگڑے تو گالی دے۔

بلا شبہ یہ چاروں خصلتیں ہرگز ہرگز مومن کی خصلتیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ منافقوں کی خصلتیں ہیں اور گناہ کبیرہ ہیں۔ لہٰذا جس طرح ایک مسلمان کو کفرو شرک اور تمام گناہ کبیرہ سے بچنا ضروری ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کو ضروری ہے کہ منافقوں کے خصائل اور منافقانہ اعمال و کردار کی گندگی اور پلیدی سے بھی جو یقیناً رزائل ہیں اپنے آپ کو بچائے رکھے۔

فوائد و مسائل

۱: اس بات پر تمام علماء اُمّت کا اجماع و اتفاق ہے کہ یہ چاروں خصلتیں اگرچہ منافقوں کے خصائل اور نفاق کی علامتیں ہیں مگر اس کے باوجود اگر کسی صادق الایمان مسلمان میں یہ چاروں خصلتیں پائی جائیں۔ تو اس کے بارے میں یہ کہنا تو درست ہے کہ اس شخص میں منافقوں کی عادتیں اور علامتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ ہرگز ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ شخص منافق ہو گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ کسی شخص میں منافق کی عادت و علامت کا پایا جانا اور بات ہے۔ اور اس شخص کا منافق ہو جانا یہ اور بات ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک سیّد کا بچہ اگر کھیت میں سے گنا چرا کر اور خاک دھول میں لوٹ پوٹ، اور کیچڑ میں لت پت ہو کر آیا۔ اور اس کے باپ نے اُس کو ڈانٹتے ہوئے یہ کہا کہ تیرے اندر تو چماروں کی خصلتیں اور عادتیں پائی جا رہی ہیں۔ تو چماروں کی خصلتیں بچے میں پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ "سید" کا بچہ "چمار" ہو گیا۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان میں منافقوں کی عادتیں پائی گئیں تو اُس سے اُس مسلمان کا منافق ہونا لازم نہیں آتا۔

۲: بعض شراحِ حدیث کا قول ہے کہ یہ ارشادِ نبوی ان منافقوں کے بارے میں ہے جو زمانۂ نبوت میں تھے۔ جو سب کے سب منافق اعتقادی بھی تھے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے فرمایا کہ ہم لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا کہ میں نے جو یہ

چاروں خصائل بیان کئے ہیں۔ وہ ان منافقوں کے بارے میں ہیں جن کے بارے میں اِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ کی سورہ نازل ہوئی ہے۔ کیا ان لوگوں کی جو حالت ہے وہی تمہاری بھی ہے؟ تو ہم لوگوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ تو ارشاد فرمایا کہ یہ حدیث تمہارے متعلق نہیں ہے۔ تم اس سے بری ہو۔ (عینی ج ا صہ ۲۵۹)

مذکورہ بالا روایت کی بنا پر حدیثِ مذکور میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے زمانے کے منافقوں کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں کہ ان لوگوں میں خیانت، جھوٹ، دغا، بدزبانی کی بری عادتیں اور گندی خصلتیں ہیں۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چاروں عادتیں بد سے بدتر خصلتیں ہیں لہٰذا ان گندی عادتوں سے ہر مسلمان کو بچنا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ ایک مومن کے اندر منافقوں کی علامتوں اور نشانیوں کا پایا جانا اس کے دامنِ ایمان پر اتنا گندہ اور گھناؤنا دھبہ ہے کہ بغیر توبہ و ترک کے ساتوں سمندر بھی اس کو دھو نہیں سکتے۔

اب ان چاروں علاماتِ نفاق کی کچھ تفصیل بھی ملاحظہ فرمایئے۔

امانت میں خیانت

پہلی علامتِ نفاق امانت میں خیانت کرنی ہے یاد رکھیئے کہ امانت ہر وہ چیز ہے جو کسی کی طرف سے کسی کو بغرض حفاظت سونپی جائے۔ امین امانت رکھنے والے کی اجازت کے بغیر اور اس کے منشا کے خلاف امانت میں جو تصرف بھی کرے گا۔ وہ خیانت کہلائے گی۔

اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیئے۔ کہ امانت صرف روپے پیسے یا سامانوں ہی کی نہیں ہوا کرتی، بلکہ بات، راز، ذمہ داری وغیرہ بھی امانت ہیں۔ مثلاً آپ سے کسی نے کوئی راز کی بات کہہ دی اور آپ سے اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ خبردار! یہ بات امانت ہے۔ آپ اس کو کسی سے ذکر نہ کریں۔ تو یہ بات بھی امانت ہو گئی۔ اور آپ اس کے امین ہو گئے۔ اگر آپ نے اس بات کو کسی سے کہہ دیا تو آپ نے امانت میں خیانت کی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مال، عقل، اختیار، آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ جسمانی اعضاء، اور قسم قسم کی طاقتیں سونپ کر حکم دیا ہے کہ میری ان امانتوں کو میرے

حکم کے مطابق استعمال کرنا۔ تو ان سب امانتوں میں بھی اگر خداوندی حقوق کو نہیں ادا کیا ہے۔ تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گی۔ اسی لیے قرآن مجید میں رب العلمین کا فرمان ہے کہ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ یعنی کان، آنکھ، دل ہر چیز کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی کہ خدا کی ان امانتوں میں کوئی خیانت تو نہیں ہوئی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" یعنی جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے جان بوجھ کر غلط مشورہ دیا تو وہ خیانت کرنے والا کہلائے گا۔

غرض "خیانت" کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ تمام حقداروں کے حقوق بھی امانت ہیں۔ کسی حقدار کا حق نہ ادا کرنا بھی امانت میں خیانت ہے۔ بسترِ جماع پر میاں بیوی کی گفت گو اور معاملات، یہ بھی امانت ہیں۔ اور میاں بیوی ایک دوسرے کے امین ہیں۔ اگر کسی نے اس راز کو فاش کر دیا تو یہ بھی امانت میں خیانت کہلائے گی۔ ملازم اپنی ڈیوٹی کا۔ حاکم رعیت کے ساتھ اپنے فرائض کا امین ہے۔ اگر ملازم نے اپنی ڈیوٹی پوری نہیں کی۔ یا حاکم نے ظلم کیا تو یہ بھی امانت میں خیانت ہے۔ غرض امانت میں خیانت کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اور ہر قسم کی امانت میں خیانت حرام و گناہ ہے۔ قرآن کریم میں غفورٌ رحیم کا ارشاد ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی اے ایمان والو! تم اللہ و رسول کے ساتھ خیانت مت کرو اور اپنے آپ کی امانتوں میں بھی خیانت مت کرو اور تم جانتے ہو۔)

جھوٹ

یہ بہت ہی ملعون عادت، سخت حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ قرآن مجید میں "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ" ۝ کہیں مشرکوں کی صفت بتائی گئی۔ کہیں کافروں کی۔ کہیں منافقوں کی، کہیں فاسقوں کی!

بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ

" تم لوگ اپنے کو جھوٹ سے بچائے رکھو۔ اس لیے کہ جھوٹ بدکاری کی

طرف راہنمائی کرتا ہے اور بدکاری جہنم میں کھینچ کر لے جاتی ہے اور آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا اور جھوٹ کا متلاشی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ دفتر خداوندی میں وہ "کذاب" لکھ دیا جاتا ہے"۔ (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان)

ایک حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا کہ کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے؟ حضور نے ارشاد فرمایا کہ ہاں" پھر اُس نے عرض کیا کہ مومن بخیل ہو سکتا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ ہاں"۔ پھر اُس نے دریافت کیا کہ کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے؟ تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ نہیں"۔ (مشکوٰۃ حفظ اللسان)

عہد شکنی

کسی سے کوئی معاہدہ یا وعدہ کر کے بلا کسی عذر شرعی کے اُس معاہدہ اور وعدہ سے پھر جانا۔ یہ عہد شکنی اور دغابازی ہے۔ جو شرعاً حرام و گناہ ہے۔ قرآن مجید میں حق جل مجدہٗ کا فرمان ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ یعنی اے ایمان والو! اپنے عہدوں اور وعدوں کو پورا کرو۔

واضح رہے کہ جس طرح کسی مخلوق سے عہد شکنی حرام و گناہ ہے۔ اسی طرح اپنے خالق و مالک اللہ تعالیٰ سے بھی عہد شکنی و بدعہدی اس سے کہیں بڑھ کر حرام و گناہ ہے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان سے اپنی توحید کے اقرار کا عہد لیا ہے۔ اور علماء کرام سے خصوصی طور پر یہ عہد لیا ہے کہ وہ کبھی بھی اور کسی حال میں بھی حق کو نہ چھپائیں۔ اس لیے جو مسلمان یا علماء کرام اپنی کسی دنیاوی مصالح کی بناء پر مشرکین کی خوشنودی کے لیے شرک کے کام کر بیٹھتے ہیں۔ یا کلمہ حق کو چھپانے، یا اس کو بیان کرنے سے سکوت کرتے ہیں وہ بھی عہد شکنی اور خدا کے ساتھ دغا کرنے کے مجرم ہیں۔

گالی

گالی گلوچ اور بدگوئی و بدزبانی خصوصاً اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ انتہائی قبیح خصلت اور نہایت ہی معیوب اور گھناؤنی عادت ہے۔ گالی گلوچ تو کجا؛ کسی مسلمان سے اس طرح کی ہنسی مذاق کرنا جس سے اس کی دل آزاری ہو یا کسی مسلمان کو ایسے القاب سے یاد کرنا جس سے اس کو ایذا پہنچتی ہو۔ خداوند عالم نے قرآن مجید میں اس کو نا مد [illegible] دیا ہے۔ سورہ حجرات کی اس آیت کو نگاہ عبرت سے دیکھنے اور منافقانہ سیرتوں

اور فاسقانہ عادتوں سے توبہ کیجئے - ارشاد خداوندی ہے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ ج اے ایمان والو! نہ مرد مردوں کا مذاق اڑائیں، عجب نہیں کہ وہ ہنسی اُڑانے والوں سے بہتر ہوں - اور نہ عورتیں عورتوں سے ہنسی ٹھٹھا کریں - ہوسکتا ہے کہ ان ہنسنے والیوں سے وہ بہتر ہوں - وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط اور آپس میں ایک دوسرے کو طعنہ مت مارو - اور نہ ایک دوسرے کے بُرے نام رکھو - بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ج وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ہ کیا ہی بُرا نام ہے مسلمان ہوکر فاسق کہلانا اور جو توبہ نہ کریں وہی لوگ ظالم ہیں (حجرات)

عبرت اللہ اکبر! جب کسی مومن سے اس قسم کا مذاق بھی جائز نہیں ہے جس سے اُس کی دل آزاری ہوتی ہو اور نہ کسی مومن کو ایسے بُرے القاب سے پکارنا جائز ہے جس میں اس کی اہانت کا پہلو ہو - تو پھر بھلا کسی مومن کو گالیاں دینا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُہٗ کُفْرٌ یعنی کسی مسلمان سے گالی گلوچ کرنا فسق ہے - اور کسی مسلمان سے جنگ کرنا یہ کافروں کا کام ہے - بہر حال کسی مسلمان کو گالیاں دے کر، یا اس کے سامنے بیہودہ، الفاظ زبان سے نکال کر ایذا دینا - یہ منافقوں کی خصلت اور منافقوں کا طریقہ ہے - گالی دینا، بیہودہ بکنا، فحش کلامی کرنا - ہرگز ہرگز مومن کا کام اور مومن کی خصلت نہیں[1] ہے - واللہ تعالیٰ اعلم -

---

[1] البتہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے منکر یا گستاخ رسول غرضیکہ کسی بھی بے دین شخص کے مقابلہ پر بعض وقت جوش میں مومن کے منہ سے کوئی گالی نکل جائے تو یہ اسکے ایمان کی نشانی ہے کہ گستاخ رسول کو سورۃ ن میں دس گالیاں (عیب ظاہر کیے) جن میں آخری حرام زادہ اسی طرح کامل سورۂ تبت اور سورۂ کوثر کی آخری آیت سے ظاہر ہے کہ ان کے عیب بیان کرنے فرض اور نفرت ایمان کی جلا انسے اللہ اور اس کے رسول کے لیے بغض و عداوت اعلیٰ تقویٰ ہے - (ناشر)

۷ مشتبہ چیزوں سے بچو

حدیث نمبر ۷

عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيْرٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اِسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يُّوَاقِعَهٗ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا اِنَّ حِمَى اللّٰهِ فِيْ اَرْضِهٖ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا اَصْلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ ۔

(بخاری ج ۱ باب فضل من استبرأ لدینہ ص ۱۳)

ترجمہ: عامر (شعبی) سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان میں کچھ مشتبہ چیزیں ہیں۔ جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے تو جو کوئی شبہ کی چیزوں سے بچ گیا۔ اُس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لیا اور جو کوئی ان شبہ کی چیزوں میں پڑ گیا۔ تو اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو بادشاہ کی محفوظ چراگاہ کے آس پاس اپنے جانوروں کو چرائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ جانور شاہی چراگاہ میں داخل ہو جائیں۔ سُن لو! ہر بادشاہ کی ایک "حمیٰ" (محفوظ ومخصوص چراگاہ) ہوتی ہے۔ اور اللہ کی "حمیٰ" اس کی زمین میں وہ چیزیں ہیں جنکو

اس نے حرام ٹھہرایا ہے ۔ خبردار! بدن میں ایک گوشت کی بوٹی ایسی ہے کہ اگر وہ درست ہے تو سارا بدن درست ہے اور اگر وہ فاسد ہو گئی تو سارا بدن بگڑ گیا۔ سُن لو! وہ دل ہے!

حضرت نعمان بن بشیر

اس حدیث کے راوی نعمان بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں ۔ ان کے والدین بھی صحابی ہیں ہجرت کے بعد قبیلہ انصار میں جو سب سے پہلا بچہ پیدا ہوا وہ آپ ہی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ کی عمر آٹھ برس سات ماہ کی تھی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں آپ کوفہ کے گورنر تھے ۔ آپ سے کل ایک سو چودہ حدیثیں مروی ہیں ۔ سنہ ۶۴ھ یا ۶۵ھ میں شہر حمص کے اندر آپ کی شہادت ہوئی صحابہ کرام میں تقریباً تیس آدمیوں کا نام "نعمان" ہے ۔ مگر نعمان بن بشیر یہی ایک ہیں ۔ (اکمال و فیوض الباری ج ا ص ۲۰۲)

شرح حدیث

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کون کون سی چیزیں حلال ہیں؛ اور کون کون سی چیزیں حرام ہیں؟ یہ تو بالکل واضح اور ظاہر ہے ۔ اور اس کو ہر عالم جانتا ہے کہ قرآن و حدیث نے جن جن چیزوں کو حلال قرار دیا ۔ وہ حلال ہیں ۔ جیسے پانی گیہوں، چاول، میوہ وغیرہ اور جن جن چیزوں کو حرام ٹھہرا دیا وہ حرام ہیں ۔ جیسے شراب، مردار، خنزیر وغیرہ لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا حلال یا حرام ہونا مشتبہ ہے ۔ اور دلائل میں تعارض ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے حلال یا حرام ہونے کو نہیں جانتے ۔ لہٰذا جو شخص حرام کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ ان مشتبہ چیزوں کو بھی چھوڑ دے گا ۔ اس کا دین محفوظ اور اس کی آبرو سلامت رہے گی اور جو شخص مشتبہ چیزوں سے پرہیز نہیں کرے گا ۔ وہ کبھی نہ کبھی حرام میں بھی ضرور مبتلا ہو جائے گا ۔ اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی چرواہا اگر اپنے جانوروں کو بادشاہ کی مخصوص چراگاہ کے اردگرد چرائے گا ۔ تو کبھی نہ کبھی اس کے جانور بادشاہ کی محفوظ چراگاہ میں بھی ضرور داخل ہو جائیں گے ۔

اور یہ چرواہا غضبِ سلطانی کی سزا میں گرفتار ہو جائے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ایک مثال دے کر سمجھاتے ہیں کہ جس طرح ہر بادشاہ کی ایک محفوظ و مخصوص چراگاہ ہوتی ہے جس میں کسی جانور کو چرانے کی اجازت نہیں ہوتی اور اس کو "حمیٰ" کہتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہوں کے بادشاہ اللہ تعالیٰ نے بھی کچھ چیزوں کو حرام ٹھہرا کر ہر شخص کو منع فرما دیا ہے کہ خبردار کوئی اس کے قریب نہ جائے۔ تو یہ حرام چیزیں گویا اللہ تعالیٰ کی "حمیٰ" ہیں۔ کہ جس طرح بادشاہوں کی حمیٰ میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کے پاس کسی کو پھٹکنے کی اجازت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کو حرام اور مشتبہ دونوں قسم کی چیزوں سے بچنا اور پرہیز کرنا ضروری ہے۔

پھر آگے ارشاد فرمایا کہ انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ایسا ہے کہ وہ اگرچہ ایک چھوٹی سی گوشت کی بوٹی ہے۔ مگر اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر وہ درست اور ٹھیک ہے۔ تو سارا بدن درست اور ٹھیک رہے گا اور اگر وہ بگڑ گیا تو سارا بدن بگڑ جائیگا اس لیے کہ ہر اچھا یا بُرا خیال اور جذبہ اسی دل ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اور بدن کا ہر ایک عضو اسی دلی خیالات و جذبات کے مطابق ہی اپنے اپنے عمل میں مشغول ہوا کرتا ہے تو دل گویا تمام اعضا بدن کا حاکم بلکہ بادشاہ ہے۔ لہٰذا اگر دل میں نیکی کا جذبہ اور خیال پیدا ہوا تو بدن کا ہر ہر عضو، اور جوڑ جوڑ نیکی کے اعمال میں مشغول ہو جائے گا۔ اور اگر دل میں بدی کا خیال اور جذبہ ہوا۔ تو پھر بدن کا ایک ایک عضو اور جسم کی ایک ایک بوٹی بدی اور گناہ کی حرکتوں میں مصروفِ عمل ہو جائے گی۔ تو پتہ چلا کہ پورے بدن کی اصلاح و فساد کا دارومدار قلب پر ہی ہے۔ اسی لیے تمام علماء شریعت و اربابِ طریقت کا اس حقیقت پر اجماع و اتفاق ہے کہ قلب اشرف الاعضاء بلکہ پورے بدن کا بادشاہ ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے قلب کی اصلاح کرے۔

اور درحقیقت تمام عقائد اسلامیہ اور صوفیاء کرام کے اذکار و مراقبات، اسی دل ہی کی اصلاح کے لیے ہیں۔ اور جس دل کی اصلاح ہو گئی اور وہ "قلبِ سلیم" کہلانے کا

مستحق ہو گیا تو اس کو اگر "عرش الہٰی" کا ہم پایہ اور خانۂ خدا کا ہم پلہ کہدیا جائے تو یہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار ہو گا جو آفتاب کی طرح عالم آشکار ہے۔ حضرت مولانا آسی علیہ الرحمہ نے اسی دل کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ ؎

بُتِ پندار جب اس میں سے جدا ہوتا ہے یہی دل رُتبے میں کعبہ سے سوا ہوتا ہے

دل جو ہے خاص گھر اس کا نہ بنایا افسوس مسجد و دیر بنایا کرو۔ کیا ہوتا ہے؟

اسی طرح کسی دوسرے عارف نے بھی "قلب مومن" کی عظمت کا خطبہ پڑھتے ہوئے کیا خوب کہا ہے ؎

دل کا بھی اک مقام ہے واعظ
مسجد و خانقاہ سے پہلے !!

فوائد و مسائل

۱ : اس حدیث کو امام بخاری و مسلم ونسائی نے کتاب البیوع میں بھی ذکر کیا ہے اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو کتاب الفتن میں تحریر کیا ہے۔

۲ : علامہ خطابی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں لا یعلمھا کثیر من الناس کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ اکثر لوگ یعنی عوام تو مشتبہات کے حکم کو نہیں جانتے مگر بعض لوگ یعنی ائمہ مجتہدین اپنے اجتہاد علمی کی بصیرت سے دلائل کے تعارض کو چھان بین کر مشتبہات کو خوب اچھی طرح جان پہچان لیتے ہیں کہ وہ حرام ہیں یا حلال۔ "مشتبہات" ان ہی لوگوں کے لیے مشتبہ ہیں جو عوام ہیں اور اجتہادی بصیرت سے محروم ہیں۔ (عینی ج ۱ ص ۳۵۰) لیکن ہاں۔ یہ ممکن ہے کہ مجتہد بھی باوجود دلائل میں انتہائی غور و فکر کرنے کے بعض مشتبہات کے حکم کو نہ پہچان سکے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ کھجور کی نبیذ کے متعلق امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے میں خود اس کو استعمال نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اس کے حرام ہونے کا فتویٰ بھی نہیں دے سکتا۔ حضرت امام کے اس قول کی وجہ یہی ہے کہ آپ کو اس کے حکم کے بارے میں اشتباہ تھا۔ اس لیے تقویٰ کا تقاضا یہی تھا کہ مشتبہ

چیزوں سے بھی پرہیز کیا جائے۔ (فیوض الباری ج ۱ ص ۲۰۳)[1]

۳۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جس کے حلال وحرام ہونے میں شبہ ہو اس سے پرہیز ہی کرنا چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

[1] اس سے وہ لوگ عبرت لیں جو حضرات خصیے اور اُلّو کو حلال کہتے اور کھاتے بلکہ کالے کوّے کو کھانا ثواب لکھتے اور حلوے وفاتحہ کے کھانے کو بہت بُرا جانتے ہوں۔

(ناشر)

عُلماءِ دینؒ

حدیث نمبر ۸

قَالَ حُمَیْدُ بنُ عَبْدِ الرَّحْمٰن سَمِعْتُ مُعَاوِیَةَ خَطِیْبًا یَقُوْلُ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ یُعْطِیْ وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْاُمَّةُ قَائِمَةً عَلٰی اَمْرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ۔

(بخاری ج ۱ باب من یرد اللہ صہ ۱۶)

ترجمہ: حُمیدبن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امیر معاویہ کو بحالت خطبہ یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے۔ اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور اس امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے دین پر قائم رہے گی۔ ان کے مخالفین ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے۔

حضرت امیر مُعاویہ

اس حدیث کے راویوں میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہستی قابلِ ذکر ہے۔ آپ سردارِ مکہ ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرزند ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام "ہند" تھا۔ شرہ فتح مکہ کے سال آپ نے اسلام قبول کیا اور دربارِ رسالت میں اتنے معتمد صحابی قرار پائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "کاتب وحی" کا عہدہ ان کو عطا فرمایا۔ خلافتِ

راشدہ کے دَور میں شام کے گورنر رہے۔ پھر تمام عالم اسلام کے بادشاہ ہوگئے۔ رجب ۶۰ھ میں اٹھہتر برس کی عمر پاکر وفات پائی۔ آپ سے ایک سو چھتیس حدیثیں مروی ہیں۔

(فیوض الباری ج ا ص ۲۲۶)

شرح حدیث

اس حدیث کے تین جزو ہیں۔ پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو دین میں "فقیہ" بناتا ہے۔ یعنی اس کو اتنا علم عطا فرماتا ہے کہ وہ اپنی علمی بصیرت سے دین کو ایمانی معرفت کے ساتھ سمجھنے لگتا ہے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیئے بلکہ یقین کر لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے ساتھ بھلائی فرمانے کا ارادہ فرمالیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کرنے اور خیر عطا فرمانے کا ارادہ فرماتا ہے۔ اس کو دین کا علم اور دین کو سمجھنے کا فہم عطا فرماتا ہے۔

اس حدیث کا دوسرا جزو یہ ہے کہ میں خدا کی نعمتوں کو تقسیم کرنے والا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نعمتوں کا عطا فرمانے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام نعمتوں کی تقسیم میرے سپرد فرمائی ہے۔ اس لیے میرے وسیلہ اور واسطہ کے بغیر کسی کو خدا کی کوئی نعمت نہیں مل سکتی۔

اس حدیث کا تیسرا جزو یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غیب کی خبر دے رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں ہر دَور کے اندر ایک جماعت ایسی ضرور رہے گی۔ جو ہمیشہ اور ہر حال میں دین پر پوری استقامت کے ساتھ قائم رہے گی۔ اور اس کے مخالفین لاکھ اس کو نقصان پہنچانا چاہیں۔ مگر ان لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور ہزاروں ظلم و جور کے باوجود بال برابر بھی اس جماعت کو صراطِ مستقیم سے نہ ہٹا سکیں گے۔

فوائد و مسائل

(۱) "فقہ" کے دو معنی آتے ہیں۔ ایک لغوی، دوسرے اصطلاحی۔ فقہ کے لغوی معنی "فہم، علم، سمجھ" ہیں اور اصطلاحی معنی کی تفصیل یہ ہے کہ احکام شریعت کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل احکام شرعیہ اعتقادیہ، یعنی وہ مسائل جن کا تعلق صرف عقائد سے ہے۔ جیسے توحید و رسالت اور قیامت وغیرہ

پر ایمان لانا۔ دوم احکام شرعیہ عملیہ یعنی وہ مسائل جن کا تعلق اعتقاد کے بعد عمل سے بھی ہے۔ جیسے نماز روزہ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ۔ پہلی قسم یعنی احکام شرعیہ اعتقادیہ کے جاننے کو "علم کلام" کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم یعنی احکام شرعیہ عملیہ کے جاننے کا نام "علم فقہ" ہے۔ اس حدیث میں "فقہ کے لغوی معنی مراد ہیں۔" یفقهه فی الدین "کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دین کا فہم، یعنی دین کو سمجھنے کا علم عطا فرماتا ہے۔

۲: انما انا قاسم واللہ یعطی کے دونوں جملوں میں اہل علم کو غور کرنا چاہیئے کہ "قَاسِمٌ" اور "یُعْطِیْ" دونوں کا مفعول محذوف کیا ہے۔ یعنی رسول کن کن چیزوں کو بانٹتے ہیں۔ اور اللہ کون کون سی چیزیں عطا فرماتا ہے۔ اس حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ مفعول محذوف کیا ہے؟ اس سوال کو حل کرنا ہے۔ تو اس میں تو کوئی شک و شبہ نہیں کہ "یعطی" کا مفعول یقیناً "كُلِّ شَيْءٍ" ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر ہر چیز کا دینے والا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جو "یعطی" کا مفعول ہوگا وہی "قَاسِمٌ" کا مفعول ہوگا۔ لہذا ثابت ہوا کہ اس حدیث کا صاف صاف حاصل مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ہر چیز کا دینے والا ہے۔ اور میں اللہ کی دی ہوئی ہر ہر چیز کا تقسیم کرنے والا ہوں۔

اس لیے معلوم ہوا کہ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں اور دولتوں میں سے کوئی نعمت اور کوئی دولت کسی کو بغیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ کے نہیں مل سکتی۔ سبحان اللہ

بے ان کے واسطے کے خدا کچھ عطا کرے

حاشا۔ غلط۔ غلط یہ ہوس بے بصر کی ہے!

۳: اس حدیث میں من یرد اللہ خیراً کے جملہ میں لفظ "خیراً" نکرہ ہے اور اس کی تنکیر یا تو نوع کے لیے ہے۔ یا تعظیم کے لیے۔ اگر اس تنکیر کو نوع کے لیے مانا جائے۔ تو حدیث شریف کا یہ مطلب ہوگا کہ "جس شخص کے ساتھ ایک خاص قسم کے خیر اور بھلائی کا خداوند تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اس کو علمِ دین عطا فرماتا ہے"۔ اور اگر یہ تنکیر تعظیم کے لیے مانی جائے تو اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جس شخص

کے ساتھ خیرِ عظیم اور بہت بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اُس کو علمِ دین عنایت فرماتا ہے۔

بہر حال اس حدیث سے علماءِ حق کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اور رحمتِ عالم کے اس فرمان میں علماءِ حق کے لیے بہت بڑی بشارت، اور تسکینِ قلب کا سامان بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ حبیب اللہ عزوجل نے علماءِ دین کے ساتھ ایک خاص قسم کی بھلائی یا بہت بڑی بھلائی کا ارادہ فرمالیا ہے، تو پھر کسی انسان یا شیطان کا شر، خُدا کے خیر پر کبھی بھی اور کہیں بھی غالب نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے ثابت ہو گیا کہ علماءِ دین کے ساتھ شر اور بُرائی کا برتاؤ کرنے والا کبھی ہرگز ہرگز فلاح نہیں پا سکتا ۔

علم دیں ہے شمعِ حق، اس کو بجھا سکتا ہے کون؟
جس کا حامی ہو خدا، اس کو مٹا سکتا ہے کون؟

لہٰذا علماءِ کرام کو لازم ہے کہ وہ کبھی بھی احساسِ کمتری میں نہ مبتلا ہوں۔ اور بڑے بڑے چودھریوں اور دولت مندوں کے سامنے کبھی ہرگز ہرگز مرعوب نہ ہوں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر نظر رکھیں۔ اور ایک دوسری حدیث بھی ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ خدا کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ۔

رشک کے قابل فقط دو ہی آدمیوں کی زندگی ہے ایک تو وہ مالدار جو خُدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ دوسرا وہ عالم جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت (علم دین) عطا فرمایا۔ اور وہ اس سے فیصلہ کرتا ہے۔ اور دوسروں کو علم سکھاتا ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم)

دیکھ لیجئے کہ مالدار سخی اور عالمِ دین کی زندگی کے سوا، کسی امیر و وزیر، یا بادشاہ کی زندگی کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ نے قابلِ رشک نہیں فرمایا ہے!

لہٰذا پتہ چلا کہ علماءِ دین کی مقدس زندگی ساری دُنیا کے لیے قابلِ رشک ہے اور جب علماءِ کرام کی زندگی قابلِ رشک زندگی ہے تو پھر علماءِ کرام کے لیے احساسِ کمتری کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ علماءِ حق بلاشبہ خدا کی زمین پر چمکتے ہوئے چراغِ ہدایت ہیں۔ خداوندِ کریم نے ان کو اپنے "خیرِ عظیم" کے ساتھ نوازا ہے۔ اسی لیے زمین پر درندے چرندے

پرندے، چیونٹیاں اپنے بلوں میں، مچھلیاں دریاؤں میں ان کے لیے دعائے رحمت کو اپنا وظیفہ بنائے ہوئے ہیں۔ فرشتوں کی مقدس جماعت ان طالبان علم دین کی رضا جوئی کے لیے اپنے پر بچھا دیتی ہے۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ! جب خالق کائنات کا فضل و کرم اور کائناتِ عالم کی دعائیں، ملائکہ کے بچھے ہوئے پر، علماء دین کا اعزاز بڑھا رہے ہیں۔ تو اگر چند مُردار قسم کے دُنیادار، علماء ربانیین کو حقارت کی نظر سے دیکھیں۔ تو اس کا کیا غم ہے؟ جو لوگ آج علماء کرام کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے مقدس رسول کے فرمانوں سے منہ موڑ لیا ہے اور دنیا کی دولت پر مغرور ہو کر اور اللہ کے نیک بندوں کی تحقیر و تذلیل کر کے اپنی آخرت کو خراب کر رہے ہیں۔

علماء حق کو لازم ہے کہ ان مغرور و بدخصال جہاں کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں۔ اور ہرگز ہرگز دل شکستہ ہو کر اعلاء کلمۃ الحق کے منصبِ جلیل سے الگ نہ ہوں۔ خداوند قدوس نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ حکم دیا کہ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ۝ یعنی اے محبوب! آپ لوگوں کی خطاؤں کو معاف فرما دیں اور نیکی کا حکم دیتے رہیں اور جاہلوں سے اعراض کرتے رہیں [1]

---

[1] البتہ جو علماء، اللہ اور اس کے رسول کے گستاخ ہیں۔ دراصل وہ علماء نہیں بلکہ اجہل ہیں حیوانوں سے بدتر ہیں کہ کسی حیوان نے اللہ و رسول کی بے ادبی نہیں کی۔

ناشر

حدیث گھڑنے والا جہنمی ہے

حدیث نمبر ۹

سَمِعْتُ رِبْعِیَّ بْنَ حِرَاشٍ یَقُوْلُ سَمِعْتُ عَلِیًّا یَقُوْلُ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَکْذِبُوْا عَلَیَّ فَاِنَّہٗ مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ فَلْیَلِجِ النَّارَ ص۲۱

(بخاری ج ۱ باب اثم من کذب علی النبی)

ترجمہ: ربعی بن حراش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر جھوٹ مت باندھو۔ کیونکہ جو مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ ضرور جہنم میں داخل ہوگا۔

اس حدیث کے راویوں میں "ربعی بن حراش" اور "حضرت علی رضی اللہ عنہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لہذا حدیث کی شرح پڑھنے سے پہلے ان دونوں مقدس بزرگوں کے احوال کے مطالعہ سے اپنی بصارت کو پُر نور کر لیجئے۔

ربعی بن حراش

کوفہ کے رہنے والے بہت ہی جلیل القدر تابعی محدث ہیں۔ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شاگرد رشید ہیں۔ بہت ہی متقی، عبادت و ریاضت میں ممتاز زندگی بھر میں کوئی جھوٹ آپ کی زبان پر نہیں آیا۔ آپ کی اور آپ کے بھائی "ربیع بن حراش" کی ایک مشہور کرامت یہ ہے کہ دونوں بھائیوں نے قسم کھالی تھی کہ ہم اس وقت تک نہیں ہنسیں گے جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ ہم جنتی ہیں چنانچہ تمام عمر میں یہ دونوں کبھی نہیں ہنسے۔ مگر انتقال کے بعد غسل دینے والوں اور دوسرے

حاضرین کا بیان ہے کہ جب تک ان دونوں کو غسل دیا جاتا رہا۔ یہ دونوں برابر لگاتار مسکرا ہنستے رہے۔ ربعی بن حراش کی وفات ۱۰۱ھ یا ۱۰۴ھ میں ہوئی۔

(نووی، تہذیب التہذیب)

حضرت علی

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جلیل الشان صحابی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ چہارم ہیں۔ بچوں میں سے سب سے پہلے آپ پر ایمان لائے۔ مدینہ ہجرت کی۔ جنگِ تبوک کے سوا تمام غزوات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریکِ جہاد رہے۔ جنگ خیبر کے دن آپ ہی کے ہاتھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا عطا فرمایا۔ اور آپ ہی نے خیبر کو فتح فرمایا۔

امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ خلیفہ ہوئے۔ تقریباً پانچ برس تک خلافت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ تریسٹھ سال کی عمر پاکر کوفہ میں ۱۹ ار رمضان ۴۰ھ کو ابن ملجم خارجی کی زہر آلود تلوار سے آپ کی شہادت ہوئی آپ نے پانچ سو چھیاسی حدیثیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ آپ کے فضائل ومناقب بہت زیادہ ہیں مفصل تذکرہ ہماری کتاب حقانی تقریریں میں پڑھیے۔

شرح حدیث

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو خود جھوٹ بولنا یا کسی دوسرے کی طرف جھوٹ کی نسبت کر دینا کہ اس نے وہ بات نہیں کہی ہے۔ مگر خواہ مخواہ اس بات کو اس کے سر تھوپ دینا، ہر جگہ، ہر حال میں ہر شخص کے لیے حرام وناجائز اور گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی جھوٹی بات کی نسبت کرنا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات کو نہیں فرمایا۔ اس بات کے بارے میں جھوٹ موٹ کا کہنا کہ حضور نے فرمایا ہے۔ یہ تمام بڑے بڑے کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کبیرہ ہے اور بلاشبہ اس گناہ کا مرتکب قہر قہار وغضب جبار کا سزاوار، جہنمی اور عذاب نار کا حقدار ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس بات کی نسبت ہو جائے گی۔ وہ شریعت اور خدا کے دین کا جزو قرار پائے گی۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ

باندھنا خدا پر بھی جھوٹی تہمت لگانا ہو جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ و رسول پر افتراء کرنا اور جھوٹی تہمت لگانا، کتنا بڑا، اور کس قدر خوفناک گناہ ہے؟ اسی لیے ایسے مردود اور خبیث شخص کا ٹھکانہ، جہنم کے سوا اور کہاں ہوگا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر کوئی جھوٹ بولے۔ یعنی میری نہ کہی ہوئی بات کو خواہ مخواہ میری طرف منسوب کرے اور کہے کہ اس بات کو حضور نے فرمایا ہے تو وہ جہنم میں جائے گا۔

فوائد و مسائل

(۱) اس حدیث کو مسلم نے اپنے مقدمۂ کتاب میں۔ ترمذی نے کتاب العلم اور مناقب میں۔ اور ابن ماجہ نے "نیت" میں ذکر کیا ہے۔

۲: اس حدیث کی بعض روایتوں میں "مُتَعَمِّدًا" کا لفظ بھی آیا ہے۔ یعنی قصداً اور جان بوجھ کر جو حضور پر جھوٹ بولے گا وہ جہنمی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر بھول چوک میں غلطی سے کسی نے ایسا کیا تو وہ اس وعید کا مستحق نہیں ہوگا۔

۳: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کا گناہ کسی دوسرے آدمی پر جھوٹ باندھنے سے بدرجہا بڑھ کر بڑا گناہ ہے۔ اسی لیے حضرات صحابۂ کرام اس گناہ سے اس قدر ڈرتے تھے کہ جب تک ان کو کسی حدیث کے بارے میں بالکل قطعی اور یقینی علم نہیں ہو جاتا تھا۔ ہرگز ہرگز اس حدیث کو کبھی بھی اپنی زبان پر نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف میں اسی حدیث کے نیچے ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے والد ماجد حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ابا جان! میں آپ کو اس طرح کثرت سے حدیثیں سناتے ہوئے نہیں دیکھتا جس طرح فلاں فلاں صحابہ حدیثیں سنایا کرتے ہیں تو حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں کبھی کسی موقع پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا تو نہیں ہوا۔ مگر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو مجھ پر جھوٹ بولے۔ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ میں اس وعید کے خوف سے حدیثوں کے بیان کرنے میں بہت احتیاط کرتا ہوں اور صرف ان ہی حدیثوں کو سناتا ہوں جو مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ اور جن کے بارے میں پورے وثوق اور یقین کے ساتھ میں جانتا ہوں کہ یہ فرمانِ رسول ہیں۔ باقی دوسرے صحابہ جو مجھ سے زیادہ حدیثیں بیان کرتے ہیں چونکہ وہ مجھ سے زیادہ حدیثوں کو یاد کئے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ مجھ سے زیادہ تعداد میں حدیثیں سُنایا کرتے ہیں۔

اسی طرح مشہور صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی فرمایا کہ

مجھ کو زیادہ تعداد میں حدیثیں بیان کرنے سے یہ بات روکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو مجھ پر جھوٹ بولے، وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالے (بخاری)

اسی طرح امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو یہ طریقہ تھا کہ اگر کوئی شخص ان کو کوئی حدیث سناتا اور وہ حدیث ان کے علم میں نہ ہوتی۔ تو آپ اُس شخص سے اُس حدیث پر گواہ طلب فرماتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ تم گواہوں سے ثابت کرو کہ یہ رسول کی حدیث ہے۔

اسی طرح بعض صحابہ حدیث سنانے والوں سے قسم کھانے کا مطالبہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم قسم کھا کر کہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔

یہ سب کچھ اسی احتیاط کے لیے تھا کہ کوئی شخص اپنی طرف سے گھڑ کر جھوٹی حدیث نہ سنائے اسی طرح حضرات تابعین اور تبع تابعین، بلکہ تمام معتمد محدثین

ؔ فرضی حدیث "کافر کو بھی کافر نہ کہنا چاہیئے"۔

جو لوگ حیران ہوں کہ کس طرح حدیث گھڑتے ہیں ان کی معلومات کے واسطے عرض ہے کہ آج کے دور میں یہ "معاذ اللہ" حدیث بہت عام کر دی گئی ہے کہ حضور نے فرمایا ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہنا چاہئے"۔ جس کے دل میں ذرا بھی حضور کی محبت کی جھلک ہے وہ فوراً جان جائیگا

(باقی صفحہ ۹۰ پر)

کا یہی طریقہ تھا کہ حدیثوں کے بیان کرنے میں بیحد احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ایک لفظ کے ادل بدل کو بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ حدیث گھڑ لینے کا کتنا گناہ اور عذاب ہے۔ اس خوف سے ہر وقت یہ لوگ لرزہ براندام رہتے تھے۔

اس لیے زمانۂ حال کے علماء و واعظین کو بھی لازم ہے کہ وہ حدیثوں کے بیان کرنے میں پوری پوری احتیاط سے کام لیں اور جو اصل مضمونِ حدیث ہے۔ اسی کو وعظوں میں بیان کریں اور ہرگز ہرگز اپنی طرف سے حدیث میں کسی لفظ کی کمی بیشی نہ کریں۔ ہاں البتہ حدیث پیش کرنے کے بعد اس کی توضیح و تشریح کرنا اور الفاظِ حدیث سے استدلال کرتے ہوئے مسائل و معارف اور نکات کو بیان کرنا جائز ہے۔ بلکہ یہ نہایت ہی پسندیدہ طرز اور سلفِ صالحین کا مقدس طریقہ ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کہ یہ حضور پر تہمت ہے کہ تسلیم بھی ہے کہ ہے تو کافر مگر کہو نہیں۔ اسطرح چوروں کا گروہ بھی کل کو حدیث بیان کرے گا کہ حضور نے فرمایا ہے کہ چور کو چور نہیں کہنا چاہیئے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ جب وجہ دریافت کرو تو بتاتے ہیں کہ کیا خبر جس کافر کو آج کافر کہہ رہے ہو اس کا مرتے وقت اسلام پر خاتمہ ہو؟ کوئی ان سے دریافت کرے کہ اس طرح تو کسی مسلمان کو بھی مسلمان نہ کہنا چاہیئے کہ کیا خبر مرتے وقت کفر پر خاتمہ ہو۔ چور کی چوری پکڑی ہو تو ان سے دریافت کریں کہ یہ حدیث کہاں ہے تو پھر پلٹی کھائیں گے کہ حضرت عمر کا قول ہے۔ جب اس چور کا پیچھا کرو اور اس کا ہی حوالہ طلب کرو تو فرار اختیار کریں گے۔ ان عقل کے دشمنوں سے پوچھو کہ کافر کو کافر نہ کہیں گے تو پھر کیا مسلمان کو کافر کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کا لفظ کس کے لیے فرمایا ہے۔ دراصل جن حضرات نے خود اللہ اور اس کے محبوب کی شانِ پاک میں گستاخیاں گالیاں کتابوں میں لکھیں جس کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں نے فتویٰ دیا کہ ایسے عقیدہ رکھنے والے مسلمان نہیں ان کے پیچھے نماز نہ ہوگی تو یہ فرضی حدیث گھڑی۔ "کافر کو بھی کافر نہ کہو"　　ناشر

۴: جھوٹی اور من گھڑت حدیثوں کو "محدثین" کی اصطلاح میں "حدیثِ موضوع" کہا جاتا ہے۔ اور جھوٹی حدیث گھڑ لینے والے کو "واضع الحدیث" یا "وضاع الحدیث" کہتے ہیں۔

جھوٹی حدیثیں گھڑنے والوں کو سلطانِ اسلام بطور تعزیر کوڑوں کی مار یا قید یا قتل کی سزا دے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

○

عذاب قبر

حدیث نمبر ۱۰

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ اِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيْرٍ اَمَّا اَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيْمَةِ ثُمَّ اَخَذَ جَرِيْدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا فَقَالَ لَعَلَّهٗ اَنْ يُّخَفَّفَ عَنْهُمَا مَالَمْ يَيْبِسَا۔

(مشکوٰۃ باب آداب الخلاء وبخاری ج ۱ باب من الکبائر ان لیستتر من بولہ ص ۳۴)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے۔ تو ارشاد فرمایا کہ یقیناً یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں اور کسی ایسے گناہ میں عذاب نہیں دیا جا رہا ہے جس سے بچنا بہت زیادہ دشوار ہو۔ ان میں ایک تو پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغل خوری کرتا تھا۔ پھر آپ نے کھجور کی ایک ہری ٹہنی لی۔ اور اس کو چیر کر دو ٹکڑے کئے پھر ہر قبر میں ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو حضور نے فرمایا اس لیے کہ جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں گی ان دونوں کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی۔

حضرت ابن عباس

اس حدیث کے راویوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بہت ہی ممتاز اور صاحب فضیلت صحابی ہیں۔ یہ حضو

علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ ان کا نام عبد اللہ ہے۔ یہ دورِ صحابہ کے سب سے کم عمر مفسّر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دُعا فرمائی تھی۔ کہ یا اللہ! ان کو حکمت اور قرآن کی تفسیر کا علم عطا فرما۔ چنانچہ اسی دُعاءِ نبوی کا اثر ہے کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔ یہاں تک کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعض مشکل مسائل میں آپ سے مشورہ لیتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ صحابۂ کرام میں چھ شخصوں نے بہت زیادہ حدیثیں روایت کی ہیں اور ان کے نام یہ ہیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ حضرت عبد اللہ بن عباس سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں مروی ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۱۳ یا ۱۴ سال کی تھی۔ (عینی ج ۱ صـ۸۳) ستر سال کی عمر میں بمقام "طائف" ۶۸ھ میں آپ نے وفات پائی۔ حضرت محمد بن حنفیہ نے نمازِ جنازہ پڑھا کر مجمع عام میں بڑی حسرت کے ساتھ یہ کہا کہ ہائے افسوس! آج اس اُمّت کا مفسّر دُنیا سے اُٹھ گیا۔ (فیوض الباری ج ۱ صـ۸۱)

شرحِ حدیث

امام بخاری نے اس حدیث کو اس عنوان کے تحت بیان فرمایا ہے کہ "باب من الکبائر ان لا یستتر من البول" اس سے امام موصوف کا مقصد یہ ہے کہ پیشاب کے وقت پردہ نہ کرنا اور لوگوں کے سامنے شرم گاہ کھول کر پیشاب کرنا یہ گناہ کبیرہ ہے اور بعض روایتوں میں "لا یستتر" کی جگہ "لا یستنزہ" کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پیشاب سے اپنے بدن اور کپڑوں کو محفوظ نہ رکھنا یہ گناہ کبیرہ ہے کیونکہ اسی حدیث میں پیشاب سے نہ بچنے والے کو قبر میں عذاب دیا جانا بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ثابت ہو گیا کہ اپنے بدن اور کپڑوں کو پیشاب سے نہ بچانا گناہِ کبیرہ اور باعثِ عذاب ہے۔

گناہِ کبیرہ کون کون ہیں؟

گناہِ کبیرہ کون کون اور کتنے ہیں؟ اس میں اختلاف ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گناہ کبیرہ کی تعداد "سات" ہے اور

وہ یہ ہیں۔ شرک[۱]، جادو[۲]، خونِ ناحق[۳]، سود خواری[۴]، یتیم کا مال کھانا[۵]، جہادِ کفار[۶] سے بھاگ جانا، پاک دامن مومن عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا (مشکوٰۃ باب الکبائر)

یہ ساتوں گناہ وہ ہیں جن کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ سات ہلاک کر دینے والے گناہوں سے بچو!

اور حاکم کی روایت میں گناہ کبیرہ کی تعداد "نو" اور بعض روایات میں اس سے زیادہ تعداد بھی بتائی گئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے کہا کہ کیا گناہِ کبیرہ سات ہی ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ گناہ کبیرہ کی تعداد سات سو تک ہے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح ایک چھوٹی سی نیکی کو خلوصِ نیت کے ساتھ اگر کوئی کرے تو اس کا اجر و ثواب بہت بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح گناہ صغیرہ یعنی چھوٹے چھوٹے گناہوں کو اگر کوئی بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ کرتا ہے تو وہ گناہِ صغیرہ بھی گناہِ کبیرہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر "گناہِ صغیرہ" پر جب اصرار کیا جائے تو وہ "گناہ کبیرہ" بن جاتا ہے۔

حضرت شیخ ابو طالب مکی سے منقول ہے کہ گناہ کبیرہ سترہ ہیں۔ چار وہ ہیں۔ جو دل سے تعلق رکھتے ہیں (۱) شرک (۲) گناہوں پر اصرار (۳) اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا (۴) اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو جانا اور چار وہ ہیں جن کا تعلق زبان سے ہے۔ (۱) جھوٹی گواہی دینا (۲) پاک دامن کو تہمت لگانا (۳) جادو کرنا (۴) حرم کعبہ میں گناہ کرنا اور تین وہ ہیں جن کا تعلق شکم سے ہے (۱) شراب پینا (۲) یتیم کا مال کھانا (۳) سود کھانا۔ دو وہ ہیں جن کا تعلق شرمگاہ سے ہے (۱) زنا (۲) لواطت۔ ایک وہ ہے جس کا تعلق پاؤں سے ہے (۱) جہاد سے بھاگنا۔ دو وہ ہیں جو ہاتھ سے تعلق رکھتے ہیں (۱) خونِ ناحق (۲) چوری (شرح عقائد و حاشیہ ص ۸۲)

واضح رہے کہ مختلف روایتوں میں جو گناہ کبیرہ کی تعداد بتائی گئی وہ حصر کے لیے نہیں ہے کہ گناہ کبیرہ سات ہیں۔ یا نو ہی ہیں یا سترہ ہی ہیں۔ بلکہ یہ مثال کے طور پر ہے کہ کسی روایت میں مثال کے طور پر سات کا ذکر آگیا۔ کسی روایت میں نو کا، کسی روایت میں سترہ کا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا گناہوں کے سوا اور بھی بہت سے گناہ کبیرہ ہیں۔ مثلاً

نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ کو چھوڑ دینا۔ ظلم کرنا۔ ڈاکہ ڈالنا۔ جھوٹ بولنا۔ چغلی کھانا۔ دو مسلمانوں کو آپس میں لڑا دینا۔ ناچ دیکھنا۔ عورتوں کا بے پردہ ہو کر پھرنا۔ ناپ تول میں کمی کرنا۔ جوا کھیلنا۔ حیض و نفاس کی حالت میں بیوی سے صحبت کرنا۔ ماں باپ کو تکلیف دینا وغیرہ وغیرہ سینکڑوں گناہ کبیرہ ہیں۔

گناہ کبیرہ کس کو کہتے ہیں

گناہ کبیرہ ہر اس گناہ کو کہتے ہیں جس سے بچنے پر خداوند عالم نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ (حاشیہ بخاری ص ۳۴) اور بعض علماء کرام نے فرمایا کہ ہر وہ گناہ جس کے کرنے پر اللہ و رسول نے وعید سنائی۔ یا لعنت فرمائی یا عذاب و غضب کا ذکر فرمایا وہ گناہ کبیرہ ہے۔ (فیوض الباری ج ا ص ۴۰۵) واللہ تعالیٰ اعلم۔

چغلی کیا ہے؟

حدیث میں لفظ "نمیمہ" آیا ہے۔ جس کا ترجمہ اُردو میں "چغلی" کیا ہے۔ علامہ عینی نے فرمایا کہ کسی کی بات کو دوسرے آدمی تک نقصان پہنچانے کے قصد سے لے جانا۔ یہ چغلی ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ یہ مسلمانوں میں خلاف و شقاق، اور جنگ و جدال کا ذریعہ ہے۔

دُوسری نجاستوں اور گناہوں سے بھی بچو

حدیثِ مذکور میں اگرچہ عذاب کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دونوں قبر والے ایک تو اُن میں سے اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلی کھاتا تھا۔ لیکن اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس خصوص میں اپنے پیشاب ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نجاست گوبر، پاخانہ، خون وغیرہ نجاستوں سے بھی پرہیز نہ کرنا عذابِ قبر کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو ہر قسم کی نجاستوں سے ہر وقت پاک و صاف رہنا چاہیئے۔

اسی طرح عذابِ قبر کا سبب بننے میں صرف "چغلی" ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس قسم کے دوسرے گناہ کبیرہ مثلاً غیبت، جھوٹ، ظلم وغیرہ بھی عذابِ قبر کا سبب بن سکتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو گناہ کبیرہ کی تمام قسموں سے اجتناب و پرہیز کرنا لازم ہے۔

عالمِ برزخ کا علم اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم برزخ کے واقعات کو دیکھتے، سنتے اور جانتے تھے۔ اس لیے کہ "عذاب قبر" عالمِ برزخ کے احوال میں سے ہے۔ بخاری شریف کی روایت "فسمع صوت انسانین یعذبان" کے الفاظ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں قبروں کے مردوں کے عذاب کا علم وحی کے ذریعے نہیں ہوا تھا۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سُن کر اور دیکھ کر عذابِ قبر کا حال معلوم فرمایا تھا۔

اس سے پتہ چلا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دیکھنے اور سُننے بلکہ ان کی تمام قوتوں کو عام انسانوں کے قوائے جسمانیہ اور بدنی طاقتوں پر قیاس نہیں کر سکتے۔ ہم عام انسان چیزوں کو اپنے حواس ظاہری یعنی آنکھ، کان وغیرہ سے دیکھتے، سنتے ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی باطنی قوتوں سے دیکھتے سُنتے ہیں اللہ اکبر! کہاں ہمارے ظاہری حواس؟ اور کہاں انبیاء علیہم السلام کی باطنی قوتیں؟

" چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک "

عارف رومی نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے ؎

فلسفی کو منکرِ حنانہ است
از حواسِ انبیاء بیگانہ است

یعنی فلسفی جو "ستونِ حنانہ" کے رونے، اور اس کی آواز سنائی دینے کے معجزہ سے انکار کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "فلسفی" انبیاء علیہم السلام کے حواس کی بے پناہ باطنی قوتوں سے ناواقف ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

نطقِ خاک و نطقِ آب و نطقِ گِل
ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

یعنی مٹی، پانی، کیچڑ کی بولیوں کو بھی اہلِ دل کے حواس محسوس کرتے اور جان لیتے ہیں۔

قبر پر پھول اس حدیث میں "لَعَلَّہٗ اَنْ یُّخَفَّفَ" یعنی کھجور کی تر شاخوں کو قبر پر ڈالنے کی حکمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی کہ ان گیلی

اور ہری ٹہنیوں کی تسبیح سے ان کے عذاب میں تخفیف ہو گی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قبروں پر تازہ پھول اور ہری پتیوں کو ڈالنا ہرگز ہرگز بدعت نہیں ہے۔ بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی حدیث پر عمل ہے لہٰذا یہ سنت ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت بریدہ اسلمی صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری قبر میں دو گیلی ٹہنیاں ڈال دی جائیں۔ (بخاری ج اول، باب الجرید علی القبر)

قبر کے پاس تلاوت

علامہ خطابی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ جب سبز ٹہنیوں کی تسبیح سے میت کے عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے تو قبر کے پاس اگر کوئی مسلمان قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ تو بدرجۂ اولیٰ اس سے میت کے عذاب میں تخفیف ہو گی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ تلاوتِ قرآن برکت و فضیلت میں شاخوں اور ٹہنیوں کی تسبیحات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ (عینی ج ۱ ص ۸۷۰)

ایصال ثواب

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کا اجر و ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بکثرت احادیث بھی وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً ابو بکر نجار نے اپنی کتاب السنن میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ

جو کوئی قبرستان میں گزرے اور گیارہ مرتبہ قُل ہُوَ اللہ پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو بخش دے تو اللہ تعالیٰ اس قبرستان کے مردوں کی تعداد میں اس کا ثواب عطا فرمائے گا

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کیا ہے کہ جو قبرستان میں جائے۔ اور سورہ یٰسین پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچائے۔ تو اللہ تعالیٰ اس میت کے عذاب میں تخفیف فرمائے گا۔

اسی طرح حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

جو شخص اپنے والدین کی قبر کی زیارت کرے اور وہاں سورہ یٰسین پڑھے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمائے گا۔ (فیوض الباری ج ۱ بحوالہ عینی ج ۱ ص ۸۷۶)

سوال وجواب

کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تو معلوم ہو گیا تھا کہ ان دونوں قبروں کے مردوں کو عذاب ہو رہا ہے اس لیے ان دونوں کے عذاب کی تخفیف کے لیے گیلی ہری شاخوں کو ان کی قبروں میں گاڑ دیا۔ لیکن ہم لوگوں کو کیا معلوم؟ کہ کون سی قبر والے کو عذاب ہو رہا ہے اور کون سی قبر والے کو نہیں۔ اس لیے ہم کیوں کسی قبر پر گیلی شاخ، یا تازہ پھول اور ہری پتیاں ڈالیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سبز پتیوں اور تازہ پھولوں کی تسبیحات سے جب عذاب قبر میں تخفیف ہو جانا حدیث سے ثابت ہے تو یقیناً ان کی تسبیحوں سے میت کو انس بھی حاصل ہوگا اور سکون و راحت بھی پہنچے گی۔ تو اگر کسی ایسی قبر پر ہم پھول پتی ڈالیں جس قبر والے کو عذاب نہیں ہو رہا ہے۔ تو اس کو اُنس اور سکون و راحت کی نعمت تو مل ہی جائیگی بہر حال قبروں پر پھول پتی ڈالنا ہر صورت میں باعث خیر و برکت اور موجب رحمت ہی ہوگا۔ صاحب قبر کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اور زائرین قبر بھی اس کی خوشبو سے فائدہ مند ہونگے۔ ہر حال میں اس سے فائدہ ہی کی امید ہے اس میں نقصان کا تو کوئی اندیشہ ہی نہیں ہے۔ لہذا جو لوگ قبروں پر پھول پتی ڈالتے ہیں۔ خواہ مخواہ ان کو بدعتی کہہ کر لوگوں کو اس کارِ خیر سے ہرگز ہرگز منع نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جیسا کہ گذر چکا حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اور یاد رکھیئے کہ جس چیز کی اصل قرآن و حدیث سے ثابت ہو وہ ہرگز ہرگز ممنوع نہیں ہو سکتی۔ نہ اس کو بدعت کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔ درحقیقت وہابیوں کا یہ ایک بہت بڑا ظلم و ستم ہے کہ وہ بات بات پر خواہ مخواہ مسلمانوں کو مشرک و بدعتی بناتے رہتے ہیں۔ اور خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو بلا کسی دلیل کے حرام ٹھہرا کر اللہ و رسول پر افتراء کرتے رہتے ہیں۔ (والعیاذ باللہ تعالیٰ منہ)

واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایمان کی مِٹھاس

حدیث نمبر ۱۱

عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ اَنْ یَّکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا وَاَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّہٗ اِلَّا لِلّٰہِ وَاَنْ یَّکْرَہَ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ کَمَا یَکْرَہُ اَنْ یُّقْذَفَ فِی النَّارِ۔

(بخاری ج ۱ کتاب الایمان ص ۷)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں جس شخص میں ہوں۔ وہ ایمان کی مٹھاس پائے گا (۱) جس کو اللہ ورسول ان دونوں کے ماسوا (سارے جہان) سے زیادہ محبوب ہوں۔ (۲) اور جو کسی آدمی سے خاص اللہ ہی کے لیے محبت رکھتا ہو (۳) اور جو اسلام قبول کرنے کے بعد پھر کفر میں جانے کو اتنا ہی برا جانے جتنا کہ آگ میں جھونک دیئے جانے کو برا جانتا ہے۔

شرح حدیث اس حدیث کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جس طرح "شکر" اور چیز ہے اور "شکر کی مٹھاس" اور چیز ہے۔ اسی طرح ایمان اور چیز ہے اور ایمان کی لذت اور چیز ہے۔ جس شخص کے منہ کا ذائقہ بالکل درست ہو۔ اگر وہ شکر کھائے گا تو اس کو شکر کی مٹھاس کا لطف و مزہ بھی محسوس ہوگا۔ لیکن اگر کوئی صفراوی بخار کا مریض جس کے منہ کا ذائقہ بگڑ کر تلخ ہو چکا ہو۔ اگر وہ شکر کھائے گا تو اس کو شکر کی مٹھاس محسوس نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ پہلا شخص تو شکر کھانے والا بھی کہلائے گا۔ اور شکر کی لذت پانے والا

بھی ہو گا۔ اور دوسرا شخص اگرچہ شکر کھانے والا تو کہلائے گا۔ مگر شکر کی مٹھاس کی لذت سے محروم ہو گا۔

بس بالکل یہی مثال ایمان کی ہے۔ جو شخص کلمہ پڑھ کر مومن ہو گیا۔ اور ایمان کے بعد اس میں تین خصلتیں پیدا ہو گئیں۔ تو وہ شخص ایمان کی مٹھاس یعنی ایمانی لذت کا لطف و مزہ بھی پالے گا۔ اور جس شخص میں یہ تینوں خصلتیں نہیں پیدا ہوئیں تو وہ شخص اگرچہ صاحبِ ایمان تو ہو گا۔ مگر ایمان کی مٹھاس یعنی ایمان کی لذتِ خاص کے لطف و مزہ سے محروم رہے گا۔

وہ تین چیزیں جن پر ایمان کی مٹھاس اور لذت کا پایا جانا موقوف ہے وہ کون کون ہیں؟ اب ان کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمایئے اور انتہائی جذبۂ اخلاص کے ساتھ انتہائی جد و جہد اور پوری پوری کوشش کیجئے کہ آپ میں یہ تینوں خصلتیں پیدا ہو جائیں تاکہ آپ ایمان کی مٹھاس، یعنی ایمان کی لذتِ خاص سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اللہ و رسول کی محبت

اللہ و رسول کی محبت کا سارے عالم سے بڑھ کر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ مومن کے دل کی گہرائیوں میں اللہ و رسول کی محبت اس طرح گھر کر جائے اور اس قدر مضبوط و مستحکم ہو جائے کہ اپنے آباء و اجداد، ازواج و اولاد، مکان و دکان، مال و سامان، جسم و جان یہاں تک کہ سارے جہان کو اللہ و رسول کی راہ میں قربان کر دینے کا سچا جذبہ پیدا ہو جائے۔

علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرماں برداری میں ایسی استقامت اور اوامر و نواہی کی تعمیل میں ایسا التزام ہو کہ کسی حال میں بھی جذبۂ استقامت اور جوشِ التزام متزلزل نہ ہو۔

حُبّ فی اللہ

صوفیہ کرام نے فرمایا ہے کہ "حب فی اللہ" اور "بغض للہ" یعنی اللہ ہی کے لیے دوستی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی یہ تصوف کی جان ہے۔ ایک مومن کے کامل ایمان کی یہ ایک بہت بڑی نشانی ہے کہ وہ اگر کسی سے دوستی کرتا ہے۔ تو اپنی کسی

غرض نفسانی کے لئے نہیں۔ بلکہ خالص رضائے الٰہی کے لیے دوستی کرتا ہے اور اگر وہ کسی سے دشمنی رکھتا ہے تو محض اللہ کی رضا، اور اس کی خوشنودی کے لیے دشمنی رکھتا ہے۔

مثلاً ہم لوگ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین سے جو محبت رکھتے ہیں۔ تو اس لیے نہیں کہ یہ لوگ ہمارے رشتہ دار ہیں یا یہ لوگ ہماری مالی امداد کر چکے ہیں۔ بلکہ صرف اس لیے ہم ان حضرات سے محبت کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے محبوب بندے ہیں۔

اور اگر ہم ابوجہل۔ ابولہب اور دوسرے کافروں یا منافقوں یا بدمذہبوں سے بغض رکھتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ان لوگوں نے ہم لوگوں کو مارا پیٹا ہے یا ہم لوگوں کا مال واسباب لوٹ لیا بلکہ ہم ان ظالموں سے صرف اس لیے دشمنی رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کے دشمن ہیں۔

اللہ ہی کے لیے دوستی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی، اسی کا دوسرا نام اخلاص ہے مومن کے لیے ہر عمل میں اخلاص وللّٰہیت کا جذبہ رکھنا یہ ایمان کی لذّت پالینے کی دوسری شرط ہے اور یاد رکھیئے کہ مومن کے جذبۂ اخلاص کی وہ طاقت ہے کہ اس کی روحانی توانائیوں کے مقابلہ میں، ہزاروں شیطانوں کی طاغوتی طاقتیں لرزہ بر اندام رہتی ہیں۔ شیطان خود ہی خدا کے دربار سے یہ کہہ کر نکلا ہے کہ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ٥ یعنی اے اللہ! میں قیامت تک اولادِ آدم کو گمراہ کرتا رہوں گا۔ مگر تیرے اخلاص والے بندوں پر میرا جادو نہیں چل سکے گا۔

حکایت اللہ اکبر! اخلاص کی طاقت کا کیا کہنا؟ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ایک عابد کو پتہ چلا کہ فلاں جنگل میں ایک درخت کو لوگ پوجتے ہیں۔ عابد کو لوگوں کے اس شرک پر بڑا جلال، اور بےحد غصہ آگیا۔ جوشِ جہاد سے سرشار ہو کر عابد نے

---

[۱] اسلام میں دو شرک ہیں۔ (۱) خدا کے علاوہ کسی کو خدا سمجھنا (۲) غیر اللہ کو خدا نہ سمجھتے ہوئے صرف عبادت کے لائق ہی سمجھے تب بھی شرک ہے۔ اب درخت ہو۔ مزار ہو، پتھر ہو۔ پانی ہو۔ غرضیکہ کاغذ ہی کیوں نہ ہو جب تک عام حالت میں ہے کوئی اس کو بوسہ نہیں دیتا جیسے ہی قرآن شریف کی آیات تحریر کیں۔

قابلِ احترام ہوگیا۔ اسی طرح پانی کو اسماعیل علیہ السلام کی ایڑی سے نسبت ہو جائے آبِ زم زم پتھر کو حضور کے لب مبارک سے نسبت ہو جائے تو بوسہ گاہ، فاروقِ اعظم بیعتِ رضوان میں درخت کو حضور سے نسبت ہو جائے تو فاروقِ اعظم اس کی اتنی عزت فرمائیں کہ اس کے قریب ہی دُوسرا درخت تھا اس کو کٹوا دیں کہ کہیں مغالطہ میں اصل درخت نظر انداز نہ ہو جائے۔ ان نسبتوں سے پتہ چلا کہ کسی شے کی پرستش کرنا اور بات ہے اور کسی نسبت سے اس کی عزت کرنا اور بات۔ الحمدللہ مسلمان ایسی چیزوں کو شعائر اللہ یعنی اللہ کی نشانیوں کی بنیاد پر عزت کرتے ہیں۔ خواہ صفا مروہ کی پہاڑیاں ہوں یا عرفات کا میدان۔ آبِ زم زم ہو یا سنگ اسود اس کو خدا یا عبادت کے لائق نہیں سمجھتے۔ وہ لوگ احتیاط کریں جو ہاتھ باندھ کر کسی کے روبرو کھڑے ہونے سے لے کر غیر اللہ سے مانگنے تک کو شرک کہتے ہیں اور وہ اپنے عقیدے کے علماء کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے سے لے کر کوئی کام کوئی چیز ایسی نہیں جو غیر اللہ سے نہ لیتے مانگتے ہوں۔

(ناشر)

ایک کلہاڑی لی اور یہ عزم کر کے چل پڑا کہ میں اس درخت کو جڑ سے کاٹ کر۔ اس شرک کی جڑ ہی کاٹ دوں گا۔ مگر ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ شیطان ایک پہلوان کی شکل میں سامنے آگیا اور کہنے لگا کہ کہاں چلے؟ عابد نے کہا کہ میں جنگل میں فلاں درخت کو کاٹنے کے لیے جا رہا ہوں۔ شیطان نے کہا کہ میں اُس درخت کا نگہبان ہوں۔ بھلا تمہاری مجال ہے کہ تم اس درخت کو کاٹ سکو گے؟ عابد جوشِ جہاد میں شیطان سے لڑ پڑا اور شیطان کو زمین پہ پچھاڑ کر اس کے سینے پہ سوار ہوگیا اور شیطان بالکل ہی عاجز و لاچار ہوگیا۔ جب شیطان ہار گیا۔ تو عابد سے کہنے لگا بھائی! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تم اس درخت کو مت کاٹو۔ اس درخت کے کاٹنے سے تم کو کیا فائدہ ہوگا؟ خواہ مخواہ تھک جاؤ گے اور رات کو نمازِ

تہجد بھی نہ پڑھ سکو گے۔ تم اس درخت کو کاٹنے کے خیال سے باز آجاؤ۔ میں اس کے بدلے میں روزانہ تم کو ایک اشرفی دیا کروں گا۔ خود بھی آرام سے کھانا پینا اور اس میں سے فقراء اور مساکین کو صدقہ بھی دیتے رہنا۔ اور انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ خدا کی عبادت میں مشغول رہنا۔ عابد پر شیطان کا جادو چل گیا۔ اور روزانہ ایک اشرفی کا نام سن کر اس پر لالچ کا بھوت سوار ہوگیا۔ عابد نے وعدہ کرلیا۔ کہ جاؤ میں اب اس درخت کو نہیں کاٹوں گا۔ چنانچہ چند دنوں تک تو شیطان عابد کے پاس روزانہ ایک اشرفی پہنچاتا رہا۔ لیکن پھر ایک دم بند کردیا۔ جب کئی دنوں تک اشرفی نہیں آئی۔ تو عابد کو بڑا غصہ آیا۔ کہ کم بخت شیطان نے مجھے دھوکہ دیا۔ پھر کلہاڑی اُٹھائی۔ تو چل کر درخت کاٹ ڈالوں۔ چنانچہ گھر میں سے نکلا ہی تھا کہ شیطان بصورتِ پہلوان سامنے آگیا اور راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ اور عابد سے کہنے لگا کہ خبردار! تم اس درخت کو کبھی ہرگز ہرگز نہیں کاٹ سکتے۔ عابد نے تڑپ کر کہا کہ میں ضرور کاٹوں گا۔ یہاں تک کہ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ مگر اب کی مرتبہ شیطان نے اس زور سے عابد کو زمین پر دے مارا کہ عابد کا سارا انجر پنجر ڈھیلا ہوگیا۔ اور شیطان عابد کے سینے پر سوار ہوگیا۔

عابد لاچار ہو کر کہنے لگا کہ یار! میں سمجھ نہیں سکا کہ پہلے دن تو میں نے بہت ہی معمولی زور لگا کر پچھاڑ دیا تھا۔ مگر آج میں اپنی پوری طاقت لگانے کے باوجود تمہاری پیٹھ نہیں لگا سکا۔ بلکہ خود ہی چت ہوگیا۔ آخر معاملہ کیا ہے؟ اُس وقت شیطان نے کہا کہ میاں جی! ہوش کی دوا کرو۔ پہلی مرتبہ جو تم درخت کاٹنے چلے تھے تو صرف خدا کی رضا جوئی اور اخلاص کی نیت لے کر چلے تھے۔ اس لیے میں تم پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ کیونکہ میں ہمیشہ خدا کے مخلص بندوں ہی سے عاجز و لاچار رہتا ہوں۔ مگر اب کی مرتبہ تم اخلاص کے ساتھ درخت کاٹنے کے لیے نہیں چلے تھے بلکہ اس غصہ میں چلے تھے کہ تم کو میں نے اشرفی نہیں دی تھی سن لو، جب تک تمہارے اندر اخلاص کی طاقت کارفرما تھی۔ میں تم سے عاجز تھا۔ اب جب کہ اخلاص کی طاقت سے تم محروم ہوگئے تو اب قیامت تک تم مجھ پر کبھی غلبہ نہیں پا سکو گے!

کفر آگ میں جانے کے برابر

تیسری چیز جس پر ایمان کی لذت و حلاوت کا پایا جانا موقوف ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کفر سے اتنا ہی بیزار اور متنفر ہو۔ جتنا کہ آگ کے شعلوں میں ڈالے جانے سے بیزار و متنفر رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جسطرح کوئی انسان کبھی کسی حالت میں بھی اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کو جلتی ہوئی آگ کے شعلوں میں جھونک دے۔ اسی طرح کسی حالت میں بھی ایک سچا مومن کفر کرنے کو کبھی ہرگز ہرگز کرہی نہیں سکتا۔ کفر کرنا اور آگ میں داخل ہونا۔ دونوں اس کے نزدیک برابر ہوں۔ جب کسی مومن کو کفر سے اتنی نفرت اور بیزاری پیدا ہو جائے تو اس کی حلاوتِ ایمان کا مزہ نصیب ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہر مومن کو حلاوتِ ایمان کی لذت سے لطف اندوز فرمائے (آمین)

فوائد و مسائل

(۱) یہ حدیث مسلم شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف میں بھی مذکور ہے۔

(۲) اگر کسی مسلمان کو کافروں نے کفر کرنے پر اس طرح مجبور کر دیا کہ اس کو اپنی جان کا خطرہ یقینی طور پر نظر آنے لگا۔ تو اگرچہ قرآن کے حکم اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ سے اس مسلمان کے لیے یہ رخصت ہے کہ وہ کفر کی بات زبان سے کہہ دے۔ بشرطیکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ لیکن اگر وہ مسلمان اس حالت میں بھی کفر کی بات زبان پر نہ لائے اور جان دے دے۔ تو بلاشبہ وہ بہت ہی افضل و اعلیٰ درجے کی شہادت سے سرفراز ہوگا۔

چنانچہ صحابہ کرام اور بہت سے شہدائے اسلام کا یہی اسوۂ حسنہ ہے کہ ان خاصان خدا کو جب کافروں نے کفر کرنے پر مجبور کر دیا اور ان کی گردنوں پر تلواریں رکھدیں۔ تو ان حضرات نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ مگر کفر کی بات اپنی زبانوں پر نہیں لائے۔ بلکہ دینِ اسلام پر استقامت کا پہاڑ بنے ہوئے۔ اپنے خون کا آخری قطرہ اور اپنی زندگی کی آخری سانس خدا کی راہ میں قربان کر کے شہادت کے اعزاز سے سرفراز ہو گئے۔ سبحان اللہ

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

رسولؐ کی بیعت

حدیث نمبر ۱۲

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا وَّهُوَ اَحَدُ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَحَوْلَهٗ عِصَابَةٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُوْنِیْ عَلٰی اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِیْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَّفٰی مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِی الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ اِلَی اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰی ذٰلِكَ۔

(بخاری ج ۱۔ کتاب الایمان صٓ)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو بدر کی لڑائی میں شریک ہوئے اور لیلۃ العقبہ کے نقیبوں میں سے ایک ہیں) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں جب کہ آپ کے گرد صحابہ کی ایک جماعت تھی۔ یہ فرمایا کہ تم لوگ مجھ سے بیعت کرو (ان باتوں پر) (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے (۲) چوری نہیں کرو گے (۳) زنا نہیں کرو گے (۴) اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے (۵) اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان گھڑ کر کسی پر بہتان نہ باندھو گے (۶) کسی شرعی حکم میں نافرمانی

نہیں کرو گے۔ تو جو اس عہد و پیمان کو پورا کرے گا۔ اس کا اجر اللہ تعالٰی کے ذمے ہے اور جو ان گناہوں میں سے کچھ کر بیٹھے اور اس کو دنیا میں اس کی سزا مل جائے۔ تو یہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس نے ان گناہوں میں سے کسی گناہ کو کر لیا اور اللہ تعالٰی نے اس کے گناہ کو چھپائے رکھا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہ چاہے گا تو اس کو معاف فرما دے گا یا آخرت میں اس کو سزا دے۔ تو ہم سب لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی۔

عبادہ بن صامت

حدیث مذکور کے راوی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بہت نامی گرامی انصاری اور صحابیِ رسول ہیں۔ بہت ہی حسین و خوبصورت اور نہایت ہی قد آور، قوی ہیکل اور مضبوط بدن کے آدمی تھے۔ عقبۂ اولیٰ، عقبۂ ثانیہ، جنگِ بدر، جنگ اُحد، بیعۃ الرضوان وغیرہ تمام مشاہد اور لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ سب سے پہلے فلسطین کے حاکم یہی بنائے گئے۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا قاضی بھی بنا دیا تھا۔ یہ شہر حمص میں مقیم ہو گئے تھے۔ پھر فلسطین چلے آئے اور ۳۴ھ میں بمقام "رملہ" بہتر برس کی عمر پاکر وصال فرمایا۔ آپ نے ایک سو اکیاسی حدیثیں روایت فرمائی ہیں۔ "عبادہ" نام کے بارہ صحابی ہیں۔ مگر "عبادہ بن صامت" آپ کے سوا کسی صحابی کا نام نہیں ہے۔ بخاری شریف میں آپ کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد کل نو ہیں۔ (فیوض الباری ج ۱ ص ۱۳۳ و قسطلانی ج ۱ ص ۲۲۳)

توضیح الفاظ

حدیث مذکور کے چند الفاظ کی تشریح حسب ذیل ہے۔

بدر مدینہ منورہ سے اٹھی میل دور ایک گاؤں کا نام ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہاں سالانہ ایک میلہ لگتا تھا۔ یہاں ایک کنواں تھا۔ جس کو "بدر" نام کے ایک شخص نے بنوایا تھا۔ چنانچہ اسی شخص کے نام پر اس گاؤں کا نام "بدر" رکھ دیا گیا۔ یہی

وہ تاریخی مقام ہے جہاں ۱۷ رمضان ۲ھ میں کفر و اسلام کا پہلا معرکہ ہوا۔ جو جنگ بدر کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں شریک ہونے والے صحابہ کا درجہ بہت ہی بلند ہے۔ اسی اعزاز کو ظاہر کرنے کے لیے راوی نے حضرت عبادہ بن صامت کے تعارف میں یہ کہا کہ " وکان شہد بدرا " کہ یہ جنگِ بدر میں شریک تھے۔

نُقَباء " نقیب " کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں سردارِ قوم۔ یا قوم کا ذمہ دار، جس کو مکھیہ بھی کہتے ہیں۔

لَیلۃُ العَقَبہ اس لفظ کا ترجمہ ہے " گھاٹی کی رات " مگر تاریخ اسلام میں یہ ایک تاریخی جگہ اور تاریخی رات کا نام ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ تھا۔ کہ ہر سال حج کے موقع پر آپ قبائلِ عرب کے سامنے دعوتِ اسلام پیش فرمایا کرتے تھے۔ پہلے سال " منیٰ " کی گھاٹی میں جہاں " مسجد العقبہ " بنی ہوئی ہے۔ مدینہ کے چھ شخصوں نے رات کی تاریکی میں چھپ کر اسلام قبول کیا۔ ان خوش نصیبوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) ابو الہیثم بن تیہان (۲) اُسعد بن زُرارہ جو ۱ھ میں وفات پا گئے (۳) عوف بن حارث (۴) رافع بن مالک یہ جنگ احد ۳ھ میں شہادت سے سرفراز ہوئے (۵) قطبہ بن عامر یہ جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے (۶) جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

یہ صاحبان منیٰ کی گھاٹی میں اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرنے گئے۔ دوسرے سال حج کے موسم میں بارہ آدمی مدینہ منورہ سے آئے اور ان لوگوں نے بھی منیٰ کی اُسی گھاٹی میں رات کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ اور اسلام پر قائم رہنے کا عہد و پیمان کیا یہی وہ بیعت ہے جو سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخوں میں " بیعت عقبۂ اولیٰ " کے نام سے مشہور ہے۔ ان بارہ اشخاص نے بیعت کر لینے کے بعد یہ خواہش ظاہر کی احکام اسلام کی تعلیم کے لیے کوئی معلم ان کے ساتھ مدینہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مُصعَب بن عُمیر رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کے ساتھ ہی مدینہ بھیج دیا۔

پھر اس سے اگلے برس ستر یا بہتر حضرات مدینہ سے حج کے لیے آئے اور ان سب لوگوں نے بھی منیٰ کی اسی گھاٹی میں مشرف بہ اسلام ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ یہ بیعت تاریخ اسلام میں "بیعت عقبہ ثانیہ" کہلاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گروہ میں سے بارہ شخصوں کو نقیب (سردار قوم) منتخب فرمایا۔ نو اشخاص قبیلۂ خزرج کے اور تین صاحبان قبیلۂ اوس کے۔ انہی میں سے ایک نقیب حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اسی لیے راوی نے ان کے تعارف میں یہ کہا کہ "وھو احد النقباء العقبۃ" یعنی حضرت عبادہ گھاٹی کی رات میں منتخب ہونے والے نقیبوں میں سے ایک نقیب ہیں اور اسی رات کا نام تاریخ اسلام میں "لیلۃ العقبۃ" ہے۔

شرح حدیث

اس حدیث شریف کا مطلب ترجمہ ہی سے ظاہر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین مجلس سے چھ چیزوں پر بیعت لی۔ اور صحابہ کرام نے بیعت کر کے ان گناہوں کے ترک کر دینے کا سچا وعدہ، اور مصمم عہد کیا کہ (۱) شرک نہیں کریں گے (۲) چوری نہیں کریں گے (۳) زنا نہیں کریں گے (۴) اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے۔ یا لڑکیوں کو عار سمجھ کر قتل نہ کریں گے (۵) کسی پر تہمت نہ لگائیں گے (۶) کسی شرعی حکم کی نافرمانی نہیں کریں گے

واضح رہے کہ یہ سب وہ گناہ کبیرہ ہیں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ نبوت میں اتنے خوفناک اور بھیانک گناہ ہیں کہ خاص طور پر ان گناہوں سے بچنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے بذریعہ بیعت عہد لیا۔ اس لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ان سب گناہوں کو جہنم کا دہکتا ہوا انگارہ سمجھ کر ان سے دور بھاگتا رہے۔

پیری مُریدی

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑنے اور اعمالِ صالحہ کے کرنے پر بیعت لینی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے اور مشائخ کرام کی "بیعت طریقت" درحقیقت اسی مقدس سنت پر عمل ہے یہ حدیث درحقیقت ان منکرین تصوف کے لیے زبردست تازیانہ عبرت ہے جو یہ کہتے پھرتے

ہیں کہ "مشائخ کی پیروی مریدی بدعت ہے"۔ لِلّٰہ! کوئی ان صاحبوں سے پوچھے کہ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے جو گناہوں کے ترک کرنے پر بیعت لی۔ اس میں اور پیرانِ کبار کی بیعت میں کیا فرق ہے؟ دونوں بیعتیں گناہوں کے چھوڑنے ہی پر ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ پیرانِ کبار کی بیعت بدعت قرار دی جائے گی؟ مگر بڑی مشکل تو یہ ہے کہ سمجھنا اور سمجھانا تو اس شخص کے لیے ہوتا ہے۔ جو سمجھنے کے لیے تیار بھی ہو۔ یہ لوگ تو سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی۔ نہ کچھ سمجھنے کو تیار ہیں۔ نہ کچھ ماننے کو۔

مثل مشہور ہے کہ "سوتے کو جگانا بہت آسان ہے مگر جاگتے کو جگانا بہت مشکل ہے، جاہل جو سادہ ورق کی طرح خالی الذہن ہوتا ہے۔ اس کے سامنے اگر کوئی حقیقت اُجاگر کر دی جائے تو اُس کا دل و دماغ بہت آسانی کے ساتھ اُس حقیقت کی تصدیق اور اعتراف کر لیتا ہے اور سچے دل سے اس کو مان لیتا ہے۔ مگر وہ پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب کی عینک لگا رکھی ہے۔ اور عناد و انکار اور بحث و تکرار کی آگ نے جن کے دل و دماغ میں فہم و بصیرت کے آشیانوں کو جلا کر بھسم کر دیا ہے ان کے سامنے لاکھ مرتبہ کسی حقیقت کے چہرے سے نقاب کشائی کر دیجئے۔ مگر نہ وہ حق کو دیکھتے ہیں۔ نہ حق کو سنتے ہیں، نہ حق کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن مجید نے ارشاد فرمایا کہ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ کہ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور کہیں یہ فرمایا کہ لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ یعنی سر کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ لیکن ان کے سینوں میں چھپے ہوئے دل اندھے ہو جاتے ہیں یعنی آنکھوں کی بصارت تو رہتی ہے۔ مگر دلوں کی بصیرت ختم ہو جاتی ہے۔
واللہ تعالیٰ اعلم۔

دُنیا میں لباس آخرت میں ننگی

حدیث نمبر ۱۳

عَنْ اُمِّ سَلْمَۃَ قَالَتْ اِسْتَیْقَظَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَیْلَۃٍ فَقَالَ سُبْحَانَ اللہِ مَاذَا اُنْزِلَ اللَّیْلَۃَ مِنَ الْفِتَنِ وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ اَیْقِظُوْا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ فَرُبَّ کَاسِیَۃٍ فِی الدُّنْیَا عَارِیَۃٌ فِی الْاٰخِرَۃِ۔

(بخاری ج ۱ . باب العلم و العظۃ باللیل صد ۲۲)

ترجمہ: حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ایک رات حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو فرمایا کہ سبحان اللہ! اس رات میں کیسے کیسے فتنے اتارے گئے؟ اور کیسے کیسے خزانے کھولے گئے؛ ان حجرے والیوں کو (عبادت کے لیے) جگاؤ۔ کیونکہ بہت سی عورتیں دنیا میں لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مگر وہ آخرت میں ننگی ہوں گی۔

اُمِّ سَلمہ اس حدیث کو روایت کرنے والی ام المومنین بی بی اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں ان کا اصلی نام "ہند" یا "رملہ" ہے اور یہ ابو امیہ کی صاحبزادی ہیں۔ یہ پہلے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ حضرت ابوسلمہ ان کو اور اپنے بچے کو ساتھ لے کر ہجرت کے لیے روانہ ہونے لگے۔ تو بی بی اُمّ سلمہ کو ان کے میکہ والوں نے روک لیا اور بچے کو حضرت ابوسلمہ کے خاندان والوں نے چھین لیا۔ حضرت ابوسلمہ بیوی بچے کو چھوڑ کر تنہا مدینہ چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد بی بی اُمِّ سلمہ اپنے بچے کو ہمراہ لے کر اکیلی ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ گئیں۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ جب ۳ھ میں وفات پا گئے تو حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بی بی اُمّ سلمہ سے عقد فرما کر ان کو امہات المومنین میں شامل فرما لیا۔ ۳۷۸ حدیثیں انہوں نے حضور سے روایت کی ہیں ۵۹ھ میں ۸۴ برس کی عمر پا کر مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ (اکمال وفیوض الباری وغیرہ)

فوائد حدیث

اس حدیث کو حضرت امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس کے علاوہ مندرجہ ذیل ابواب میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ صلوٰۃ اللیل۔ علامات النبوۃ۔ کتاب الادب۔ کتاب اللباس۔ کتاب الفتن اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صرف کتاب الفتن میں درج کیا ہے۔

۲: خداوند عالم جل جلالہٗ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ ہونے والے فتنوں اور فتوحات کے خزانوں کا خواب میں، یا بیداری میں مشاہدہ کرایا اور آپ نے ان کی کثرت کو دیکھ کر تعجب کا اظہار فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ سبحان اللہ آج کی رات میں کس قدر زیادہ فتنے اور خزانے آسمان سے زمین پر اتارے گئے۔

بخاری شریف کی ایک دوسری روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہارے گھروں میں اس طرح فتنوں کو گرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں جس طرح بارش کے قطرات مسلسل اور لگاتار زمین پر گرتے ہیں۔

۳: بخاری شریف کے حواشی میں ہے کہ فتنوں سے مُراد "عذاب" اور خزانوں سے مراد "رحمتیں" ہیں۔ اور بعض شارحین حدیث نے فرمایا کہ فتنوں سے مراد آئندہ ہونے والے وہ فسادات اور لڑائیاں ہیں جو اس امت کے لیے باعثِ فتنہ ہیں۔ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت، جنگِ جمل۔ جنگِ صِفّین۔ جنگِ حُرّہ، جنگ کربلا وغیرہ جن سے بہت زیادہ فتنے پھیلے اور مسلمانوں کا بے حد جانی و مالی نقصان ہوا۔ نووی علی المسلم ج ۲ ص ۳۸۹)

اور خزانوں سے مراد وہ فتوحات ہیں جو خلفاء راشدین یا ان کے بعد آنے والے مسلم سلاطین کو حاصل ہوئیں کہ فارس و روم بلکہ یورپ و ایشیا کے خزانے مفتوح ہو کر اسلامی بیت المال میں پہنچ گئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

۴: اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "حجرے والیوں" یعنی اپنی ازواج مطہرات

کو جگانے کا حکم فرمایا۔ تاکہ وہ اُٹھ کر نماز تہجد پڑھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک طریقہ اور عادت کریمہ تھی کہ جب کوئی خوفناک منظر آپ دیکھتے تھے تو فوراً نماز میں مشغول ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے تھے۔ چونکہ اس وقت ازواجِ مطہرات ہی نظروں کے سامنے تھیں۔ اس لیے آپ نے ان کو جگانے کا حکم دیا۔ تاکہ خود بھی حضور عبادت میں مصروف ہو جائیں اور امت کی مائیں بھی خدا کی عبادت میں لگ جائیں۔

۵: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مقدس بیویوں کو عبادت کے لیے جگانے کا حکم دیا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ بہت سی عورتیں جو اس دنیا میں قسم قسم کے لباسوں میں ملبوس نظر آتی ہیں قیامت کے دن نیکیوں اور اعمالِ صالحہ سے ننگی ہوں گی۔ کیونکہ آخرت میں لباس اور جنت کی پوشاک ملنے کا دارومدار نیک اعمال ہی پر ہے۔ تو جن عورتوں نے دنیا میں نیکیوں کا ذخیرہ نہیں جمع کیا اور اچھے اعمال سے خالی ہاتھ آخرت میں گئیں۔ تو بھلا انہیں آخرت میں کہاں سے لباس ملے گا؟ اس لیے وہ دنیا میں تو اگرچہ قسم قسم کے لباسوں میں ملبوس رہی ہیں مگر آخرت میں بالکل ہی ننگی ہوں گی۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں خصوصی طور پر اپنی بیویوں اور دوسری عورتوں کو اعمالِ صالحہ کی ترغیب دی۔ تاکہ وہ دنیا میں خدا کی عبادت کر کے آخرت کے لباس کا سامان کر لیں۔

مسائل حدیث

اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہے (۱) رات میں اپنے اہل وعیال کو خدا کی عبادت کے لیے جگانا مستحب ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ کسی اہم واقعہ کا ظہور ہوا ہو۔

۲: تعجب کے مواقع پر "سبحان اللہ" کہنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے۔

۳: رات میں بھی نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے منع کرنا اور لوگوں کو مسائل دین بتانا جائز ہے۔

۴: خاص کر اپنے اہل وعیال کو نصیحت کرنا اور ان کو ترغیب و ترہیب سنانا بھی جائز ہے۔

۵: فقط عورتوں ہی کو وعظ سنانا بھی جائز ہے۔

۶: اگر کسی شخص کو کسی فتنہ یا کسی خوشخبری کی اطلاع ہو جائے تو لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

خونِ ناحق

حدیث نمبر ۱۴

عَنْ جَرِیْرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَہٗ فِیْ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ اِسْتَنْصِتِ النَّاسَ فَقَالَ لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔

(بخاری باب الانصات للعلماء ج ۱ ص ۲۳)

ترجمہ: حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "حجۃ الوداع" میں فرمایا کہ "تم لوگوں کو خاموش کرو" پھر حضور نے فرمایا کہ تم لوگ میرے بعد پلٹ کر کفار مت ہو جانا کہ تمہارا بعض بعض کی گردن مارے۔

حضرت جریر اس حدیث کے راوی حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ مشہور باکرامت محدث ابو زرعہ کے دادا ہیں۔ حضرت جریر بہت ہی خوبصورت اور دراز قد تھے۔ اتنے لمبے تھے کہ اُونٹ کی کوہان تک ان کا سر پہنچتا تھا۔ اور ان کا جوتا ایک ہاتھ لمبا ہوتا تھا۔ (قسطلانی ج ۱ ص ۱۳۸) سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ سے ایک سو حدیثیں مروی ہیں اور آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آپ کوفہ سے "قرقیس" چلے گئے تھے۔ وہیں سنہ ۵۱ھ میں آپ کی رحلت ہو گئی۔ (فیوض الباری ج ۱ ص ۲۱۰ و اکمال وغیرہ)

حجۃ الوداع اس حدیث میں "حجۃ الوداع" کا ذکر آیا ہے۔ اس کی توضیح و تشریح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ھ میں آخری حج فرمایا۔ اس حج کو "حجۃ الوداع" اس لیے کہتے ہیں کہ "وداع" کے معنی رخصت کرنے کے ہیں۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حج میں تمام قبائل عرب کو اس طرح رخصت فرمایا۔

جیسے کہ دنیا سے سفر کرنے والا اپنے پسماندگان کو رخصت کیا کرتا ہے۔ اس حج کا نام "حجۃ الوداع" ہو گیا۔

شرح حدیث

یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک طویل خطبہ کا ایک ٹکڑا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ حضور نے اپنے آخری حج "حجۃ الوداع" کے موقع پر جب کہ لوگ منیٰ میں جمروں کو کنکری مارنے کے لیے جمع تھے اس وقت یہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔

حاشیہ بخاری شریف میں ہے کہ اس حدیث میں صرف دو ہی جملے ہیں۔ ایک "لا ترجعوا بعدی کفاراً" دوسرا یضرب بعضکم رقاب بعض" اب دو حال سے خالی نہیں یا تو دوسرا جملہ پہلے جملہ کا بیان ہے۔ یا دو الگ الگ مستقل جملے ہیں اگر دوسرا جملہ پہلے جملہ کا بیان ہو تو حدیث کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ تم لوگ میرے بعد کافروں جیسا کام۔ یعنی ایک دوسرے کی گردن مارنا۔ یہ دھندا کبھی ہرگز مت کرنا اور اگر دوسرا جملہ پہلے جملہ کا بیان نہ قرار دیا جائے۔ تو حدیث کا حاصل مفہوم یہ ہو گا کہ حضور نے اس حدیث میں اپنی امت کو دو باتوں سے منع فرمایا۔ ایک بات تو یہ کہ تم لوگ میرے بعد کافر مت ہو جانا۔ بلکہ آخری دم تک اسلام پر قائم رہنا اور دوسری بات یہ کہ تم ایک دوسرے کو ناحق قتل مت کرنا۔

فوائد و مسائل

۱: اس حدیث کو امام بخاری نے "مغازی" اور "دیات" میں بھی ذکر فرمایا ہے اور امام مسلم نے کتاب الایمان میں اور نسائی نے کتاب العلم میں اور ابن ماجہ نے کتاب الفتن میں تحریر فرمایا ہے۔

۲: مسلمان کے قتل کو حلال سمجھ کر کسی مسلمان کا خون کر دینا کفر ہے۔ اور مسلمان کے قتل کو حرام جانتے اور مانتے ہوئے کسی مسلمان کو ناحق قتل کر دینا گناہ کبیرہ ہے۔ جس پر قرآن مجید میں عذاب شدید کی وعید آئی ہے۔ (۳) عالموں کی تقریر کے لیے بات چیت کرنیوالے مجمع کو خاموش کرانا جائز ہے۔ (۴) وعظ و تقریر کے وقت حاضرین مجلس کو خاموش ہو کر سکون و اطمینان کے ساتھ وعظ اور خطبہ سننا لازم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کُتّے کو پانی پلانے والا

حدیث نمبر ۱۵

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلًا رَأٰی کَلْبًا یَاْکُلُ الثَّرٰی مِنَ الْعَطَشِ فَاَخَذَ الرَّجُلُ خُفَّهٗ فَجَعَلَ یَغْرِفُ لَهٗ حَتّٰی اَرْوَاهُ فَشَکَرَ اللّٰهُ لَهٗ فَاَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ۔

(بخاری ج ۱ - باب ایماء الذی یغسل بہ شعر الانسان ص ۲۹)

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آدمی نے ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا۔ تو اس شخص نے اپنا موزہ لیا اور اس میں چلو سے پانی بھر کر اس کُتّے کو پلایا۔ یہاں تک کہ وہ سیراب ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ کام پسند آیا اور اس کو جنّت میں داخل کر دیا۔

فوائد و مسائل

۱: یہ حدیث بخاری شریف میں "شرب" "مظالم" "ادب" "ذکر بنی اسرائیل" کے بابوں میں بھی مذکور ہے اور مسلم نے "باب الحیوان" اور ابوداؤد نے "کتاب الجہاد" میں بھی نقل کیا ہے۔

۲: یہ حدیث بخاری شریف کی ایک روایت میں یوں بھی آئی ہے کہ اس حدیث کو سُن کر صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا چوپایوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں بھی ہم کو ثواب ملے گا؟ تو ارشاد فرمایا کہ ہاں "فِیْ کُلِّ کَبَدٍ رَطْبَةٍ اَجْرًا" ہر گیلے جگر میں یعنی ہر جاندار کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں ثواب ہے۔ (قسطلانی ج ا ص ۴۴۲)

اور یہی حدیث انہی حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اسی بخاری شریف میں اسطرح بھی آئی ہے کہ:

"ایک شخص پر راستہ چلتے ہوئے پیاس کا غلبہ ہوا تو اس کو ایک کنواں ملا۔ اُس نے کنویں میں اتر کر پانی پی لیا۔ پھر جب وہ کنویں میں سے نکلا۔ تو ناگہاں یہ دیکھا کہ ایک کتا زبان نکالے ہوئے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ تو اس آدمی نے دل میں سوچا کہ جیسی پیاس مجھ کو لگی تھی۔ ایسی ہی پیاس اس کتے کو بھی لگی ہے تو وہ کنویں میں اتر کر اپنے موزہ میں پانی بھر کر لایا۔ پھر کتے کو پلایا۔ تو اس کا یہ عمل خدا کو پسند آگیا اور اس کو بخش دیا۔ یہ سُن کر صحابہ نے کہا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارے لیے چوپایوں کے ساتھ احسان کرنے میں ثواب ہے؟ تو ارشاد فرمایا کہ ہاں۔ ہر گیلے جگر میں یعنی ہر جاندار کے ساتھ احسان کرنے میں ثواب ہے۔"

۳: اس روایت میں تو یہ واقعہ بنی اسرائیل کے ایک مرد کا ہے۔ مگر بخاری شریف کی ایک دوسری روایت میں اسی قسم کا ایک واقعہ زناکار عورت کا بھی بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ

غُفِرَ لِامْرَأَةٍ مُومِسَةٍ مَرَّتْ بِكَلْبٍ عَلٰى رَاسِ رَكِيٍّ يَلْهَثُ كَادَ يَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَأَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهُ مِنَ الْمَاءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذَالِكَ

(بخاری باب اذ وقع الذباب ج ا صہ ۴۶۷)

یعنی ایک زناکار عورت کی مغفرت اس طرح ہو گئی کہ وہ ایک کتے کے پاس سے گزری۔ جو ایک کنویں کے پاس زبان نکالے ہوئے تھا اور قریب تھا کہ پیاس کی شدت اس کو مار ڈالے۔ تو اس عورت نے اپنا موزہ نکالا اور اس کو اپنے دوپٹے میں باندھ کر کنویں میں سے پانی بھر کر اس کو پلایا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس عمل کے اجر میں اس کو بخش دیا۔

۴: اس حدیث میں تمام مخلوق پر رحم و کرم کرنے کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ فاعلِ مختار ہے۔ وہ چاہے تو ایک بہت ہی ادنیٰ سے نیک عمل کرنے والے کو اپنے فضل و کرم سے بخش دے۔ اس کے دربار میں عمل کے وزن اور مقدار

کو نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ اس کی بارگاہ میں خلوصِ نیت اور اخلاصِ عمل کی قدر ہے۔ بہت ہی معمولی عمل اگر بندہ اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ کرے تو وہ رب کریم اس عمل کے ثواب میں بندے کو اپنے رضوان و غفران کی نعمتوں سے سرفراز فرما کر اس کو جنت الفردوس کا مکین بنا دیتا ہے ؎

رحمتِ حق بہانہ می جوید رحمتِ حق بہا، نمی جوید

خدا کی رحمت بندوں کو بخشنے کا بہانہ ڈھونڈھتی ہے۔ خدا کی رحمت بندوں سے مغفرت کی قیمت نہیں طلب کرتی ہے۔

۵ : امام نووی نے حدیثِ مذکور کے تحت میں فرمایا کہ اَلْمُحْتَرَمِ یَحْصُلُ الثَّوَابُ بِالْاِحْسَانِ اِلَیْهِ لَا غَیْرُ الْمُحْتَرَمِ کَالْحَرْبِیِّ وَالْکَلْبِ الْعَقُوْرِ (قسطلانی ج ۱۰ ص ۱۳۳)

یعنی اس حدیث میں ہر مخلوق کے ساتھ احسان کرنے کی جو ترغیب دلائی گئی ہے اس سے وہی مخلوق مراد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محترم اور قابلِ اعزاز ہے۔ ورنہ وہ مخلوق جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محترم اور قابل عزت نہیں ہے۔ جیسے کافر حربی اور لوگوں کو کاٹنے والا کتا، ان کے ساتھ احسان کرنے میں کوئی اجر و ثواب نہیں ہے۔

۶ : جب جانوروں کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کا یہ درجہ ہے کہ ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دینے والا جنت میں داخل ہو گیا۔ تو بھوکے پیاسے مومنوں کو کھانا پانی سے سیراب کرنے والا کتنے بڑے بڑے اجر عظیم کا مستحق ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو بہشت میں کیسے کیسے مدارج و منازل عطا فرمائے گا؟ اس کی کیفیت و کمیت کو بھلا "علام الغیوب" کے سوا اور کون جان سکتا ہے؟ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ اللہ کا فضل و کرم بہت ہی بڑا ہے۔

بلّی کو بھوک سے مارنے والی

حدیث نمبر ۱۶

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ دَخَلَتِ امْرَأَۃٌ النَّارَ فِیْ ھِرَّۃٍ رَبَطَتْھَا فَلَمْ تُطْعِمْھَا وَلَمْ تَدَعْھَا تَأْکُلُ مِنْ خُشَاشِ الْاَرْضِ ۔

(بخاری باب خمس من الدواب ج ا ص ۴۶۷)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت ایک بلی کے معاملہ میں جہنّم میں داخل ہوئی۔ اُس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا۔ نہ تو اس کو کچھ کھلایا نہ اس کو چھوڑا کہ وہ حشراتُ الارض کو کھاتی (یہاں تک کہ وہ بھوکی مرگئی)

حضرت ابنِ عمر

اس حدیث کے راوی حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ ہیں ان کا نام عبداللہ ہے۔ اور یہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نامور فرزند ہیں بچپن ہی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے اور ہجرت کرکے مدینہ گئے جنگِ خندق اور بیعۃ الرضوان وغیرہ میں شریک ہوئے۔ انتہائی عابد و زاہد اور متقی و پرہیز گار صحابی ہیں۔ اپنی زندگی میں ایک ہزار سے زائد غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سے ہر شخص کے پاس دُنیا آگئی۔ مگر حضرت عبداللہ اور ان کے والد امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے پاس سے دُنیا کا گزر نہیں ہوا۔ میمون بن مہران تابعی کہا کرتے تھے میں نے ابنِ عمر سے بڑھ کر متقی اور ابن عباس سے بڑھ کر علم والا کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک ہزار

چھ سو تیس حدیثیں آپ نے روایت فرمائی ہیں۔ جن میں سے ایک سو ستر حدیثیں ایسی ہیں کہ وہ بخاری شریف و مسلم دونوں کتابوں میں ہیں اور اکیاسی حدیثیں وہ ہیں جو صرف بخاری شریف میں ہیں اور اکتیس حدیثیں ایسی ہیں جو صرف مسلم شریف میں ہیں۔ علم فقہ و حدیث میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جن میں حضرت سالم و حمزہ و عبید اللہ و امام نافع جیسے بلند پایہ فقہاء و محدثین ہیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی ظالم گورنر کو آپ حج کے مسائل اور دوسرے شرعی معاملات میں ٹوکتے رہتے تھے۔ اس ظالم کو یہ ناگوار ہوا اور اس نے اپنے ایک سپاہی کے ذریعہ زہر آلود برچھی سے آپ کے پاؤں کے تلے میں زخم لگوا دیا۔ جس سے سارے بدن میں زہر کا اثر پھیل گیا۔ اور آپ مکہ مکرمہ میں علیل ہو گئے۔ تو مکار حجاج بن یوسف ظالم آپ کی بیمار پرسی کے لیے آیا۔ آپ اسی علالت میں عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین ماہ بعد ۷۳ھ میں چوراسی یا چھیاسی سال کی عمر میں وصال فرما گئے اور مکہ مکرمہ کے قبرستان مہاجرین ذی طویٰ میں مدفون ہوئے۔ (اکمال مع حاشیہ)

فوائد و مسائل ۱: یہ حدیث بخاری و مسلم وغیرہ میں متعدد روایتوں اور مختلف لفظوں کے ساتھ بہت جگہ آئی ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جہنم میں دیکھا کہ وہ بلی اُس عورت کو نوچ رہی ہے (بخاری ج ۱ ص ۳۱۸)

۲: جس طرح اس سے پہلے والی حدیث میں جانوروں پر رحم اور احسان کرنے کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس حدیث میں جانوروں پر ظلم کرنے کی بُرائی اور اس کے بُرے انجام کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ عورت ایک بلی کو ظلم سے مار ڈالنے کی وجہ سے جہنم میں گئی۔

۳: امام نووی نے فرمایا کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بلی یا کسی بھی جانور کو بھوکا پیاسا باندھے رہنا، یا قید میں رکھنا حرام ہے۔ کیونکہ یہ عورت باوجود مسلمان ہونے کے اسی گناہ کی وجہ سے جہنم میں داخل کی گئی۔ اور اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ

جانوروں کا چارہ پانی مالک کے اوپر واجب ہے۔ اگر مالک اپنے جانوروں کو بھوکا پیاسا رکھے گا تو گناہگار ہو گا۔ (نووی علی المسلم ج ۲ صہ ۲۳۶)

۴: غیر موذی جانوروں پر کسی قسم کا ظلم کرنا حرام ہے۔ جو لوگ گھوڑوں، گدھوں پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادتے ہیں۔ یا بلا وجہ مارتے پیٹتے ہیں یا تفریح کے طور پر بلا ضرورت جانوروں کو زدوکوب کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اس حدیث میں لرزہ بر اندام کرنے والی اور عبرت خیز وعید ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ظلم کے گناہ سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ظالم اپنی ہی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے۔ تو حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ کیوں نہیں۔ ظالم کے ظلم کی نحوست سے باری تعالیٰ بارش بند فرما دیتا ہے تو حُباری (ایک پرند) اپنے گھونسلے میں لاغر ہو کر ظالم کے ظلم کی وجہ سے مر جاتی ہے۔ (مشکوٰۃ باب الظلم)

بہر حال ظلم، خواہ کسی انسان پر ہو۔ یا کسی جانور پہ بہر حال حرام اور جہنم میں داخل ہونے کا سبب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وعظ کے لیے دن مقرّر کرنا

حدیث نمبر ۱۷

عَنْ اَبِیْ وَائِلٍ کَانَ عَبْدُ اللّٰهِ یُذَکِّرُ النَّاسَ فِیْ کُلِّ خَمِیْسٍ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُ اَنَّكَ ذَکَّرْتَنَا کُلَّ یَوْمٍ قَالَ اَمَا اِنَّهٗ یَمْنَعُنِیْ مِنْ ذٰلِكَ اَنِّیْ اَکْرَهُ اَنْ اُمِلَّکُمْ وَاِنِّیْ اَتَخَوَّلُکُمْ بِالْمَوْعِظَةِ کَمَا کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّاٰمَةِ عَلَیْنَا۔

(بخاری باب العلم قبل القول والعمل ج ۱ صد ۱۶)

ترجمہ: حضرت ابو وائل (شفیق بن سلمہ) سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کے دن وعظ فرمایا کرتے تھے۔ تو ایک آدمی نے ان سے کہا کہ اے ابو عبد الرحمٰن! میری تمنا ہے کہ آپ روزانہ ہم کو وعظ سنایا کریں تو آپ نے فرمایا کہ (روزانہ وعظ کہنے سے) جو چیز مجھے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کو تنگی میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ اور میں تمہاری فرصت کا خیال رکھتا ہوں جیسے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وعظ سنانے میں ہماری فرصت کا خیال رکھتے تھے۔ اس خوف سے کہ ہم اکتا نہ جائیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود

اس حدیث کے راویوں میں حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی رضی اللہ عنہ بہت جامع فضائل و کمالات ہیں ابتداہی میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس لیے سابقین اولین میں آپ کا شمار ہے۔ یہاں تک کہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آپ چھٹے مسلمان ہیں۔ مکہ سے حبشہ اور حبشہ سے مدینہ دونوں ہجرتوں کا شرف آپ کو حاصل ہے۔ آپ کی کنیت ابوعبدالرحمٰن اور لقب "صاحب النعلین والوسادہ والمطہرہ" ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین اور مسند، نیز وضو کا برتن اور مسواک وغیرہ آپ ہی کی تحویل میں رہتی تھیں۔ جنگ بدر اور دوسری لڑائیوں میں بھی شریک جہاد رہے اور عمر بھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح حاضر باش اور راز دار رہے کہ باہر سے آنے والے لوگ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ آپ بہت ہی دبلے پتلے اور پستہ قد تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنت کی بشارت دی اور یہ فرمایا کہ میں اپنی امت کے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو یہ پسند کریں۔ اور اسی کو ناپسند سمجھتا ہوں جس کو یہ ناپسند کریں۔ امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور امیرالمومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کوفہ کے قاضی اور بیت المال کے منیجر رہے آٹھ سو اڑتالیس حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔ فقہِ حنفی کا دارومدار زیادہ تر آپ ہی کی روایات پر ہے۔ آخری عمر میں آپ کوفہ سے مدینہ چلے آئے اور ۳۲ھ میں ساٹھ سال سے زیادہ عمر پاکر وصال فرمایا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

(اکمال و فیوض الباری صـ ۱۰۸)

فوائد و مسائل

۱: اس حدیث کو امام بخاری نے اس کے علاوہ "کتاب الدعوت" میں اور مسلم نے باب توبہ میں اور ترمذی نے باب استیذان میں ذکر کیا ہے۔

۲: حدیث کا مطلب واضح رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں وعظ فرمایا کرتے تھے جب لوگ اپنے کام دھندے سے فرصت پاکر اطمینان سے سن سکیں۔

اسی لیے حضرت عبد اللہ بن مسعود ہفتہ میں ایک ہی مرتبہ جمعرات کے دن اپنے وعظ کا پروگرام رکھتے تھے تاکہ لوگ اُس دن اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر اور فرصت پا کر سکون واطمینان کے ساتھ وعظ سن سکیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وعظ کے جلسوں کے لیے وقت اور دن مقرر کر دینے میں سامعین کو بڑی آسانی ہوا کرتی ہے۔ کیوں کہ جب لوگوں کو پہلے سے معلوم رہتا ہے کہ فلاں دن اور فلاں وقت وعظ ہونے والا ہے۔ تو لوگ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اور فرصت کا وقت نکال کر شوق سے وعظوں کے جلسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ اور ان کے کاروبار کا پروگرام بھی نہیں بگڑتا۔

۳: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ محفل میلاد شریف، جلسۂ رجبی شریف، جلسۂ بارہویں شریف، جلسۂ گیارہویں شریف وغیرہ کے لیے وقت اور دن مقرر کرنا ہرگز ہرگز بدعت اور گناہ نہیں ہے بلکہ ایک جلیل القدر صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود کا طریقہ ہے کہ آپ نے جمعرات کے دن کو وعظ کے لیے معین اور مقرر فرما دیا تھا۔

جو لوگ میلاد شریف میں تعیینِ وقت اور تداعی (ایک دوسرے کو دعوت دینے) سے چڑتے اور منہ بگاڑتے ہیں اور اس کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ تعصب اور ہٹ دھرمی کی عینک اتار کر اس حدیث کو دیکھ لیں تو ان پر بھی اس حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا کہ کسی جائز کام کو دن مقرر کر کے کرنا نہ صرف جائز بلکہ اخلاص و نیتِ خیر کے ساتھ ہو تو مستحب و مستحسن بھی ہے۔

۴: اس حدیث سے یہ بھی سمجھ میں آیا ہے کہ علماء کرام کا فرض منصبی ہے کہ وہ اپنے مواعظ اور تقریروں کے ذریعہ عوام میں تبلیغ و تذکیر کرتے رہیں۔ صحابۂ کرام اور تابعین و تبع تابعین بلکہ ان کے بعد کے علماء بھی برابر عوام کی اصلاح اور تبلیغ اسلام کی غرض سے وعظ و تقریر فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قول تو یہ تھا کہ

> اگر تم لوگ میری گردن پر تلوار رکھ دو۔ اور پھر اس حالت میں بھی اگر میں یہ سمجھ لوں کہ گردن کٹنے سے پہلے میں ایک بات جو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے اس کو تم لوگوں تک پہنچا سکوں گا۔ تو اس کو ضرور پہنچا دوں گا۔

(بخاری ج ۱ ص ۱۶)

۵ : اس حدیث میں " الی اکرہ ان املکم " کے جملہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ عالموں کو اپنے وعظوں میں اس کا لحاظ، خیال رکھنا چاہیئے کہ لوگ وعظ سے اکتا کر رنج و ملال میں نہ پڑ جائیں۔ لہذا اتنی ہی دیر تک وعظ بیان کرنا چاہیئے۔ جب تک لوگ نشاط اور شوق کے ساتھ سنتے رہیں۔ وعظ کو اتنا طول نہیں دینا چاہیئے کہ لوگ گھبرا کر بد دلی کے ساتھ سننے لگیں۔ ورنہ اللہ و رسول کے کلام و احکام کو سننے میں بے رغبتی کا گناہ لازم آئے گا۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

○

فتنوں کا سیلاب

حدیث نمبر ۱۸

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّہٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْشِكُ اَنْ یَّكُوْنَ خَیْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ یَتَّبِعُ بِھَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ۔

(بخاری باب من الدین الفرار من الفتن ج ۱ ص ۷)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی۔ جن کے پیچھے پیچھے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات پر بھاگتا ہوا چلا جائے گا تاکہ وہ اپنے دین کو فتنوں سے بچا لے۔

حضرت ابوسعید خدری اس حدیث کے راوی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ ان کا نام سعد بن مالک ہے اور یہ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ کا نام "خُدرہ" تھا۔ اس لیے "خدری" کہلاتے ہیں۔ ۷۴ھ میں چوراسی برس کی عمر پاکر انتقال فرمایا۔ اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (اکمال)

تیرہ غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جہاد رہے۔ ایک سو ستّر حدیثیں آپ سے مروی ہیں اور بخاری شریف میں باسٹھ حدیثیں آپ کی روایت کی ہوئی مذکور ہیں۔ (فیوض الباری ج ۱ ص ۱۶۲) مگر قسطلانی نے لکھا ہے کہ بخاری شریف میں آپ کی

روایت سے چھیاسٹھ حدیثیں ہیں۔ (ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۲۷)

توضیح الفاظ

اس حدیث کے چند الفاظ کی توضیح حسب ذیل ہے:

"غنم" بکری کو کہتے ہیں۔ اسم مؤنث ہے۔ نر و مادہ دونوں کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ "شعف" پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع "شعاف" ہے۔

"فتن" فتنہ کی جمع ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل معانی آتے ہیں۔

آزمائش، گمراہی، شرک، رسوائی، رنج، دیوانگی، عبرت، عذاب، مرض، مال و اولاد، اختلاف، جنگ و جدال (المنجد وغیرہ)

مگر اس حدیث میں اور عام طور پر "کتاب الفتن" کی حدیثوں میں فتنہ سے مراد "اختلاف اُمت" اور وہ فسادات ہیں جو دین میں خرابی پڑ جانے کا باعث ہیں۔ (النووی وغیرہ)

شرح حدیث

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں غیب کی خبر دے رہے ہیں۔ کہ میرے بعد عنقریب میری اُمت میں بہت سے فتنے پیدا ہو جائیں گے۔ اُس وقت مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی۔ کہ مسلمان ان کو اپنے ساتھ لے کر اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر گوشہ نشین ہو جائے گا۔ بکریوں کا دودھ پیتا رہے گا اور خدا کی عبادت کرتا رہے گا۔ اس زمانے میں روپیہ پیسہ مومن کا بہترین مال نہیں رہے گا۔ کیونکہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر روپیہ پیسہ کچھ کام نہیں آئے گا۔ اور شہروں کا جہاں روپیوں پیسوں سے کام چلتا ہے اس قدر فتنے ہوں گے کہ ایک مومن کے لیے آبادیوں میں اپنے دین کو فتنوں سے بچانا بہت دشوار ہو جائے گا۔

اس حدیث میں خاص طور پر پہاڑوں کی چوٹیوں پر مومن کے جانے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ایسے مقامات عموماً فتنہ و فساد سے محفوظ رہتے ہیں۔

اور مویشیوں میں سے خصوصیت کے ساتھ بکریوں کا تذکرہ اس لیے فرمایا کہ اونٹوں گایوں، بھینسوں کی نسبت بکریوں کو لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر جانا، اور وہاں ان کی نگہداشت بہت آسان ہے۔ کیونکہ بکری بہت ہی مسکین صفت جانور ہے۔ اس

میں بدک کر بھاگنے، اور سرکشی وایذا رسانی کی صفت نہیں ہے۔ اس کا دودھ بھی بے ضرر ہے اور یہ بہت ہی بابرکت جانور بھی ہے۔ کیونکہ خدا کے ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں۔ اس لیے بکریوں کو چرانا سُنّت بھی ہے۔ ورنہ فتنوں سے بچنے کے لیے گوشہ نشینی کے واسطے بکری ہی لے کر جانا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ:

جس کے پاس اُونٹ ہوں۔ وہ اپنے اونٹوں کے پاس چراگاہ میں چلا جائے اور جس کے پاس بکریاں ہوں وہ اپنی بکریوں کے ریوڑ میں چلا جائے اور جس کے پاس زمین ہو وہ اپنی زمین پر چلا جائے۔ (مسلم شریف کتاب الفتن ج ۲ صفحہ ۳۸۹)

فوائد و مسائل

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ دوسری سینکڑوں حدیثوں میں اپنی امت کو ان فتنوں سے آگاہ فرمایا ہے۔ جو زمانۂ نبوت کے بعد وقوع پذیر ہونیوالے ہیں اور ان فتنوں سے پناہ مانگنے اور ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ سینکڑوں حدیثوں میں سے صرف دو حدیثیں پیش کرتا ہوں۔

۱: عنقریب کچھ فتنے ایسے رونما ہوں گے کہ ان فتنوں کے وقت میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور جو فتنوں کا سامنا کرے گا فتنے اس پر غالب آجائینگے۔ لہٰذا جو شخص کوئی ٹھکانہ، یا جائے پناہ پا جائے تو اُس کو چاہیئے کہ وہ وہاں جا کر فتنوں سے بچ جائے۔ (بخاری ج ۲ صفحہ ۱۰۴۸)

۲۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا کہ ان فتنوں کے آنے سے پہلے ہی جلدی جلدی اعمال صالحہ کر لو۔ جو فتنے اندھیری رات کے ٹکڑوں کے مثل ہوں گے۔ ان فتنوں میں آدمی صبح کو مومن اور شام تک کافر ہو جائے گا۔ اور شام کو مومن رہے گا اور صبح تک کافر ہو جائے گا۔ دنیا کے حقیر سامانوں کے بدلے اپنا دین بیچ ڈالے گا۔

(مسلم و مشکوٰۃ کتاب الفتن)

غرض فتنوں کے بارے میں اس قسم کی بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کے دور میں ایمان کی حفاظت کے لیے اس حدیث میں ایک تدبیر بتائی ہے کہ جب اس قسم کے فتنے نمودار ہوں کہ بستیوں اور آبادیوں میں دین کے خراب ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو مومن کو چاہیئے کہ گوشہ نشینی اختیار کر لے۔ تاکہ فتنوں سے محفوظ رہے۔

گوشہ نشینی

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ فتنوں کے دور میں مومن کے لیے گوشہ نشینی بہتر ہے؟ یا آبادیوں میں رہ کر فتنوں کا مقابلہ کرنا بہتر ہے؟

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ فتنوں کے وقت میں گوشہ نشینی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں تعلیم و تعلّم کا دروازہ بند ہو جائے گا اور آدمی جمعہ و جماعت کی فضیلتوں سے محروم ہو جائے گا۔

اور دوسرے علماء کا قول ہے کہ فتنوں کے دور میں گوشہ نشینی ہی بہتر ہے۔ تاکہ آدمی فتنوں سے محفوظ رہے مگر حق یہ ہے کہ اس مسئلہ کا دارومدار احوال و ماحول اور فتنوں کی نوعیت پر ہے۔ اگر فتنے اس قدر شدید ہیں کہ یہ نہ ان کو دفع کر سکتا ہے نہ ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بلکہ شدید خطرہ ہے کہ یہ خود فتنوں کے طوفان میں اپنا دین کھو بیٹھے گا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اس شخص کے لیے گوشہ نشینی ہی بہتر ہے۔ اور اگر یہ شخص فتنوں کا مقابلہ کر کے فتنوں کو ختم کر سکتا ہے یا خود فتنوں سے بچ کر امتِ رسول کو بھی بچا سکتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس شخص کے لیے گوشہ نشینی ہرگز ہرگز جائز نہیں ہو سکتی بلکہ اس شخص پر واجب ہے کہ شہروں اور قصبوں میں رہ کر فتنوں کا مقابلہ کرے اور ان فتنوں کو دفع کرنے کی سعی بلیغ کرتا رہے۔ اس حدیث میں بکریوں کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلے جانے کا جو ذکر ہے۔ وہ اسی صورت میں ہے جب کہ مومن کو فتنوں کے مدافعت کی طاقت نہ ہو۔ بلکہ خود فتنوں میں مبتلا ہونے کا یقین یا ظنِ غالب ہو چکا ہو۔

چنانچہ اس سلسلے میں ترمذی اور ابنِ ماجہ کی ایک حدیث ہے جو اس مضمون پر شاہد عادل ہے۔

حضرت ابو ثعلبہ خُشَنی رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے اس آیت کے بارے میں سوال

کیا کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ !

تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے اس آیت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا۔ تو حضور نے یہ فرمایا کہ تم لوگ ہمیشہ نیکی کا حکم دیتے رہو۔ اور بدی سے منع کرتے رہو۔ یہاں تک کہ جب تم یہ دیکھ لو کہ ہر شخص بخل کا پیروکار بن گیا اور سب لوگ دنیا کو دین پر ترجیح دینے لگے اور ہر شخص اپنی ہی رائے کو سب سے بہتر سمجھنے لگا۔ اور تم ایسے فتنوں کو دیکھ لو کہ ان سے بچنا دشوار ہو جائے۔ تو پھر تم لوگ اپنی ہی ذات کو لازم پکڑ لو اور عوام کے معاملہ کو بالکل چھوڑ دو۔ (یعنی گوشہ نشین ہو جاؤ) کیونکہ تمہارے بعد صبر کے دن آ رہے ہیں۔ جو ان دنوں میں صبر کر لے گا۔ گویا ہاتھ میں آگ کا انگارہ لے گا۔ اُن دنوں میں جو نیک اعمال کرے گا۔ اس کو پچاس آدمیوں کے اعمال صالحہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ان لوگوں میں سے پچاس آدمیوں کے اعمال صالحہ کا اجر اس کو ملے گا؟ یا ہم صحابہ کے پچاس آدمیوں کے اعمالِ صالحہ کا ثواب اُس کو ملے گا؟ تو ارشاد فرمایا کہ تم (صحابہ) میں سے پچاس آدمیوں کے اعمالِ صالحہ کا ثواب اُس کو ملے گا۔

(مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف) واللہ تعالیٰ اعلم !

○

آقا اور غلام ایک لباس میں

حدیث نمبر ۱۹

عَنِ الْمَعْرُوْرِ قَالَ لَقِيْتُ اَبَاذَرٍ بِالرَّبَذَةِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَعَلٰى غُلَامِهٖ حُلَّةٌ فَسَئَلْتُهٗ عَنْ ذَالِكَ فَقَالَ اِنِّىْ سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهٗ بِاُمِّهٖ فَقَالَ لِىَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَاذَرٍّ اَعَيَّرْتَهٗ بِاُمِّهٖ اِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ ۔

(بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیۃ ج ۱ صـ ۹)

ترجمہ: حضرت معرور سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے " ربذہ " میں ملاقات کی ۔ وہ اور ان کا غلام ایک ہی جیسا جوڑا پہنے ہوئے تھے ۔ تو میں نے اس کے بارے میں ان سے سوال کیا ۔ تو حضرت ابوذر نے فرمایا کہ میں نے ایک شخص سے گالی گلوچ کی اور اس کی ماں کی گالی دی ۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوذر! تم نے اس کو ماں کی گالی دی ؛ تم ایسے آدمی ہو کہ تمہارے اندر جاہلیت کی خصلت ہے ؛ تمہارے لونڈی غلام تمہارے (دینی) بھائی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تمہارا ماتحت بنا دیا ہے تو جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو ۔ اس کو چاہیے کہ جو خود کھائے اس کو کھلائے اور جو خود پہنے اس کو پہنائے اور تم ان خادموں کو ایسے کاموں

کی تکلیف مت دو جو انہیں لاچار کر دے اور اگر تم ایسی تکلیف دو تو خود بھی کام میں ان کی مدد کرو۔

حضرت ابوذر یہ بہت ہی قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کا قول ہے کہ اسلام قبول کرنے میں باہری لوگوں کے اندر ان کا پانچواں نمبر ہے ان کے مسلمان ہونے کا پورا حال بخاری شریف میں مفصل مذکور ہے۔ اسلام لانے کے بعد سترہ دنوں تک یہ صرف آب زمزم پی پی کر مسجد کعبہ میں مقیم رہے۔ روزانہ یہ چلا چلا کر مجمع کفار میں اپنے اسلام کا اعلان کرتے تھے۔ اور کفارِ مکہ ان کو اس قدر مارتے تھے کہ یہ لہولہان ہو کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ مگر ہوش میں آنے کے بعد پھر اپنے اسلام کا اعلان کرتے تھے۔ ان کا اسم گرامی "جُندوب بن جنادہ" ہے۔ بہت ہی عابد وزاہد اور انتہائی متقی صحابی ہیں۔ دو سو اکیاسی حدیثیں آپ نے روایت کی ہیں ۳۲ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں بمقام "ربذہ" آپ کا وصال ہوا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

رَبذہ مدینہ منورہ سے تین منزل دور ایک جگہ کا نام ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کے وصال پر غم زدہ ہو کر حضرت ابوذر مدینہ منورہ سے ملکِ شام چلے گئے تھے۔ وہاں شام کے گورنر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ان کا ایک مسئلہ میں اختلاف ہو گیا۔ تو حضرت امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر کو ملک شام سے بلا کر "رَبذہ" میں قیام کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ یہ آخری دم تک "ربذہ" ہی میں رہے۔

شرح حدیث حدیثِ مذکور کا خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ جناب معرور جب حضرت ابوذر کی ملاقات کے لیے رُبذہ حاضر ہوئے۔ تو یہ منظر دیکھا کہ آپ کے اور آپ کے غلام کے بدن پر بالکل ایک قسم ہی کا جوڑا ہے۔ آقا اور غلام دونوں کا لباس یکساں دیکھ کر قدرتی طور پر جناب مُعرور کے دل میں اس

سوال نے سر اٹھایا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کہ آقا اور غلام دونوں ایک ہی قسم کے لباس میں ملبوس ہیں تو آپ نے حضرت ابوذر سے اس کے متعلق سوال کیا تو حضرت ابوذر نے اس کا یہ جواب دیا۔ کہ میں نے ایک شخص کو ایک مرتبہ ماں کی گالی دے دی۔ اس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کر دی۔ تو حضور نے سرزنش کے طور پر مجھ سے فرمایا کہ کیا تو نے اس کو ماں کی گالی دی ہے؟ اے ابوذر! مسلمان ہونے کے بعد بھی تیرے اندر زمانہ جاہلیت کی خصلت باقی ہے؟ اس کے بعد حضور نے مجھے یہ نصیحت فرمائی کہ تم اپنے لونڈی غلاموں اور نوکروں چاکروں کو ہرگز ہرگز حقیر و ذلیل مت سمجھو۔ بلکہ یہ سمجھو کہ یہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ جن کو خدا نے تمہارے ماتحت بنا کر تمہارے قبضہ میں دے دیا ہے۔ لہذا اگر تمہارا کوئی دینی بھائی تمہارا ماتحت اور تمہارا غلام ہو۔ تو اس کے ساتھ برادرانہ سلوک کرو۔ یہاں تک کہ جو تم خود کھاتے ہو وہی اس کو کھلاؤ۔ اور جو تم خود پہنتے ہو وہی اس کو بھی پہناؤ۔ اور ان لوگوں سے ان کی طاقت سے زیادہ مشقت کا کام نہ کراؤ۔ اور اگر کوئی مشقت کا کام ان لوگوں کے سپرد کرو۔ تو تم خود بھی ان لوگوں کی مدد کرو۔ اس لیے میں نے حضور کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنا یہ دستور بنا لیا ہے کہ میں جو کھاتا ہوں وہی اپنے غلام کو بھی کھلاتا ہوں۔ اور جس قسم کا جوڑا خود پہنتا ہوں۔ اسی قسم کا جوڑا اپنے غلام کو بھی پہناتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تم میرا اور میرے غلام کا لباس ایک ہی جیسا دیکھ رہے ہو۔

حضرت ابوذر کا ایک شاہکار

حضرت ابوذر نے جس شخص کو ماں کی گالی دی تھی وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہیں۔ کیا گالی دی تھی۔ بس اتنا کہدیا تھا کہ (اے کالی ماں کے بیٹے) حضرت بلال نے جب دربارِ رسالت میں اس کی شکایت کی تو سرکارِ مدینہ نے حضرت ابوذر کو ڈانٹا اور نصیحت فرمائی۔ اس کے بعد حضرت ابوذر پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا؟ یہ بہت ہی لرزہ براندام کر دینے والی داستان ہے۔ اس کو بار بار پڑھتے رہیے اور خدا کے خوف سے ڈرتے رہیے۔

دربارِ رسالت کی ملامت سُن کر فوراً ہی حضرت ابوذر حضرت بلال کی خدمت

میں ندامت کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اور ایک دم اپنا حسین رُخسار زمین پر رکھ انتہائی لجاجت کے ساتھ روتے اور گڑگڑاتے ہوئے یہ کہا کہ اے بلال! جب تک تم اپنے قدم کے تلوے سے میرے اس رخسار کو نہ روندو گے۔ میں اس وقت تک اپنا یہ چہرہ ہرگز ہرگز زمین سے نہیں اٹھاؤں گا۔

حضرت ابوذر کے شدید اصرار سے مجبور ہو کر حضرت بلال نے بادلِ نخواستہ اپنا قدم ابوذر کے چہرے پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا اور حضرت ابوذر کو معاف کر دیا۔

(ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۴۶)

علامہ قسطلانی نے اس واقعہ کے بارے میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ حضرت ابوذر نے یہ عار دلانے والی بات حضرت بلال کے لیے اس وقت کہی تھی جب کہ حضرت ابوذر کو اس قسم کے الفاظ کی حرمت کا علم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ حضرت ابوذر جیسے پیکرِ تقویٰ و پرہیزگاری سے ایسی بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ لفظ کہہ کر ان کی سرزنش فرمائی کہ "تمہارے اندر ابھی جاہلیت کی خصلت باقی ہے" اور یہ زجر و توبیخ بھی ان کے بلند مراتب کی وجہ سے ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی کی زبان سے اتنی چھوٹی اور گری ہوئی بات نہیں نکلنی چاہیئے تھی۔

(ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۴۶)

مسائل حدیث

حدیثِ مذکورہ بالا سے حسبِ ذیل مسائل ثابت ہوتے ہیں!

۱: کسی مسلمان کو اگرچہ وہ لونڈی غلام یا نوکر چاکر ہی کیوں نہ ہو۔ گالی دینا حرام ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُہٗ کُفْرٌ یعنی کسی مسلمان سے گالی گلوچ کرنا فاسق کا کام ہے اور کسی مسلمان سے جنگ و قتال کرنا کافر کا کام ہے۔

۲: غلاموں اور نوکروں کو محض ان کی غلامی اور نوکری کی بناء پر حقیر و ذلیل سمجھنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ بزرگی کا دار و مدار ذات، خاندان یا دولت و حکومت پر نہیں ہے، بلکہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ کے فرمانِ الٰہی نے ہمیشہ کے لیے اس مسئلہ

پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ بزرگی کا دار و مدار تقویٰ اور پرہیزگاری پر ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ غلام آقا سے زیادہ پرہیزگار اور خدا کے نزدیک عزت والا ہو۔

۳: حدیث مذکور میں " فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس" کا امر وجوبی نہیں ہے۔ بلکہ یہ امر ارشادی یا امر استحبابی ہے۔ لہٰذا آقا جو کھائے اور جو پہنے وہی غلاموں کو بھی کھلائے اور پہنائے یہ واجب نہیں ہے۔ بلکہ مستحب اور کارِ ثواب ہے۔

لیکن بہر حال اس حدیث سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ غلاموں اور نوکروں کو بہت زیادہ خراب کھانا اور کپڑا انہیں دینا چاہیئے، بلکہ اپنی اور غلام یا نوکر کی حیثیتوں کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب درجے کا کھانا، کپڑا دینا آقا پر لازم ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم!

○

زمین کی پیٹھ بہتر یا پیٹ؟

حدیث نمبر ۲۰

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. اِذَا كَانَ اُمَرَاءُكُمْ خِيَارَكُمْ وَاَغْنِيَاءُكُمْ سُمَحَاءَكُمْ وَاَمْرُكُمْ شُوْرٰى بَيْنَكُمْ فَظَهْرُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ بَطْنِهَا وَاِذَا كَانَ اُمَرَاءُكُمْ شِرَارَكُمْ وَاَغْنِيَاءُكُمْ بُخَلَاءَكُمْ وَاُمُوْرُكُمْ اِلٰى نِسَائِكُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا رواه الترمذی۔

(مشکوٰۃ باب تغیر الناس صـ ۴۵۹)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارے اُمراء تم میں سے بہترین لوگ ہوں اور تمہارے مالدار سخی ہوں۔ اور تمہارا معاملہ آپس کے مشوروں سے طے ہوتا ہے تو تمہارے لیے زمین کی پیٹھ، زمین کے پیٹ سے بہتر ہے اور جب تمہارے اُمراء بدترین لوگ ہوں اور تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتیں طے کرنے لگیں تو تمہارے لیے زمین کا پیٹ زمین کی پیٹھ سے بہتر ہے۔

شرح حدیث ۱: اس حدیث میں زمین کی پیٹھ سے مراد "زمین کے اُوپر زندہ رہنا" اور زمین کے پیٹ سے مراد "مرکر زمین میں مدفون ہونا" ہے۔ ظاہر ہے کہ جب

سلطنت کے امراء اور حکومت کے حکام نیک اور صالح لوگ ہوں گے تو اُن کے عدل و انصاف سے زمین پر امن و امان اور سکون و اطمینان کا دَور دورہ ہوگا۔ اور ظلم و طغیان سرکشی و عصیان، غرض ہر قسم کے جرائم کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اور دن رات زمین پر رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا رہے گا۔

اسی طرح جب مالدار سخی ہوں گے۔ تو وہ اپنی دولت کو نیک کاموں میں خرچ کریں گے اور مساجد و مدارس اور دوسرے دینی اداروں اور اسلامی مرکزوں کی ترقی اور رونق بڑھے گی۔ کوئی ننگا بھوکا نہیں رہے گا۔ غربا، مالداروں سے محبت کریں گے۔ امیری فقیری کی جنگ ختم، اور طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اسی طرح جب اُمراء اور حکام کا تقرر اور تمام قومی معاملات آپس کے مشوروں سے طے پاتے رہیں گے۔ تو بغض و کینہ اور تحاسد و تباغض کا روئے زمین سے جنازہ نکل جائے گا۔ اور ہر شخص کو سکون و اطمینان کے ساتھ نیکیوں اور اعمال صالحہ میں مصروف و مشغول رہنے کا موقع ملے گا ایسی صورت میں جب کہ روئے زمین کا چپہ چپہ امن و چین اور سکون و راحت کی جنت بنا ہوا ہو اور ہر طرف تجارتِ آخرت کے بازار میں چہل پہل اور رونق ہی رونق نظر آرہی ہو تو بلا شبہ یقیناً ایک مسلمان کی زندگی، اس کی موت سے بدرجہا خوشتر، اور زمین کی پیٹھ زمین کے پیٹ سے بہتر ہوگی۔

برخلاف اس کے جب حکومت کے امراء و حکام بدکار و حرام کار اور عیاش و بدمعاش ہوں گے تو ظاہر ہے کہ عدل و انصاف نہ ہونے سے زمین پر ہر طرف فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوگا اور ہر چہار جانب روئے زمین پر تاراج، بلکہ شیطان کا راج ہوگا۔

اسی طرح جب مالدار بخیل ہو جائیں گے اور صدقات و خیرات کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ تو غرباء و مساکین ننگے بھوکے ہوں گے۔ مزدور و سرمایہ دار کی جنگ شروع ہو جائے گی۔ اور طبقاتی کشمکش کا اژدہا منہ پھاڑے رُوئے زمین پر لہراتا ہوگا۔ مساجد و مدارس کی رونق میں کمی اور دینی اداروں کی بہاریں نذرِ خزاں اور اسلامی مراکز کے گلشنوں میں ویرانی کے اُلّو بول رہے ہوں گے۔ دینداری کی مجلسوں کے چراغ بجھ چکے

ہوں گے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا!

اسی طرح جب لوگ تمام معاملات میں عورتوں کے مشوروں کو دخیل بنالیں گے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ ناقصاتِ عقل و دین ایسا ہی مشورہ دیں گی۔ جو تباہی و بربادی کا سگنل اور دین و دنیا کی خرابیوں کے لیے ہری جھنڈی ہوگی۔ اور ملک و ملت کی ساری شان و شوکت غارت ہو کر رہ جائے گی۔ غرض ساری دنیا طرح طرح کے جرائم و مفاسد کا بھیانک جنگل اور پوری زندگی دینی و دنیاوی ہلاکتوں اور بربادیوں کا جہنم بن کر رہ جائے گی۔ ایسی صورت میں بلاشبہ یقیناً ایک مسلمان کی موت اس کی زندگی سے بدرجہا اچھی اور زمین کا پیٹ زمین کی پیٹھ سے ہزاروں درجہ بہتر ہوگا۔

اسی لیے ایک حدیث شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا تَذْھَبُ الدُّنْیَا حَتّٰی یَمُرَّ الرَّجُلُ عَلَی الْقَبْرِ فَیَتَمَرَّغُ عَلَیْہِ وَ یَقُوْلُ یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ مَکَانَ صَاحِبِ ھٰذَا الْقَبْرِ۔ (مسلم ج ۲ ص ۳۹۴)	میں اُس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ دنیا اُس وقت تک نہیں جائیگی یہاں تک کہ آدمی قبر پر جاکر بولے گا اور کہے گا کہ کاش اس قبر والے کی جگہ پر میں ہوتا۔

توبہ، توبہ! نعوذ باللہ منہ۔ یا اللہ! ہم ان فتنوں سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔

پانچ گناہ ، پانچ عذاب

حدیث نمبر ۲۱

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا ظَهَرَ الْغُلُوْلُ فِيْ قَوْمٍ اِلَّا اَلْقَى اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ ۝ وَلَا فَشَا الزِّنَا فِيْ قَوْمٍ اِلَّا كَثُرَ فِيْهِمُ الْمَوْتُ ۝ وَلَا نَقَصَ قَوْمٌ الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلَّا قُطِعَ عَنْهُمُ الرِّزْقُ ۝ وَلَا حَكَمَ قَوْمٌ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الدَّمُ ۝ وَلَا خَتَرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ اِلَّا سُلِّطَ عَلَيْهِمُ الْعَدُوُّ ۝

(مشکوٰۃ باب تغیر الناس ص ۴۵۹)

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ۔ انہوں نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں خیانت ظاہر اور کھلم کھلا ہونے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کے دل میں اس کے دشمنوں کا خوف اور ڈر ڈال دیتا ہے اور جب کسی قوم میں زناکاری پھیل جاتی ہے ۔ تو اس قوم میں بکثرت موتیں ہونے لگتی ہیں اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے ۔ اُس قوم کی روزی کاٹ دی جاتی ہے ۔ اور جو قوم ناحق فیصلہ کرنے لگتی ہے ۔ اس قوم میں خون ریزی پھیل جاتی ہے اور جو قوم عہد شکنی اور بدعہدی کرنے لگتی ہے اس قوم پر اس کے دشمن کو غالب و مسلط کر دیا جاتا ہے ۔

شرح حدیث

جس طرح دواؤں اور غذاؤں میں خداوند قدوس نے قسم قسم کی تاثیرات پیدا فرمائی ہیں ۔ کہ زہر مار ڈالتا ہے ۔ تریاق زہر کے اثرات کو زائل کر

دیتا ہے۔ بعض غذائیں صحت کو برباد کر دیتی ہیں۔ اور بعض غذائیں تندرستی کو بڑھا دیتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے قول و افعال میں بھی قدرت نے قسم قسم کی تاثیرات رکھ دی ہیں۔ مثلاً آپ کی "گالی" دنیا بھر کے انسانوں کو آپ کا دشمن بنا دیتی ہے۔ اور آپ کی "دعاء" دنیا بھر کو آپ کا دوست بنا دیتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی کو "مکہ" دکھائیں تو وہ آپ پر غضبناک ہو جاتا ہے۔ اور اگر آپ کسی کے آگے ہاتھ جوڑیں تو وہ آپ پر رحم دل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ انسان کے ہر قول و عمل میں قدرت نے قسم قسم کی تاثیریں اور طرح طرح کے اثرات پیدا فرمائے ہیں۔ نیک اعمال اور اچھے اچھے اقوال کی تاثیرات و اثرات بھی اچھے ہوا کرتے ہیں اور برے اعمال اور برے اقوال کی تاثیرات و اثرات بھی برے ہوا کرتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں پانچ برے اعمال اور ان کی بری تاثیروں کا بیان فرمایا ہے۔

۱: خیانت کی تاثیر یہ ہے کہ جو قوم امانت میں خیانت کرنے لگے گی تو وہ قوم اپنے دشمنوں سے خائف، ڈرپوک اور بزدل ہو جائے گی۔

۲: اور جو قوم زناکاری کی لعنت میں گرفتار ہو جائے گی۔ تو اس قوم پر طرح طرح کی بلائیں بیماریاں اور وبائیں آئیں گی۔ اور بکثرت لوگ مرنے لگیں گے۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "جہاں زنا، وہاں فنا"

۳: اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرے گی۔ تو اس کا یہ اثر ہوگا۔ کہ ان کی روزیوں کی برکت کٹ جائے گی۔ وہ عمر بھر روزی کمانے کے لیے دربدر کی ٹھوکر کھاتے پھریں گے اور ہزاروں لاکھوں کمائیں گے بھی۔ مگر ان کے دل کو چین اور روح کو سکون اور دولت کو قرار نہیں حاصل ہوگا اور کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ دولت کہاں سے آئی؟ اور کدھر چلی گئی؟

۴۔ اور جو قوم ناحق فیصلہ کرنے کی خوگر ہو جائے گی۔ تو اس گناہ کا یہ اثر ہوگا کہ اس قوم میں قتل و خون ریزی کی بلا پھیل جائے گی۔ اور روزانہ دن رات ہر طرف قتل ہی

ہوتے رہیں گے۔

۵ : اسی طرح جو قوم بدعہدی کی راہ پر چل پڑے گی اس قوم کی عزت و اقبال اور اس کی سلطنت کے جاہ و جلال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اس قوم پر اس کے دشمنوں کا غلبہ و اقتدار ہو جائے گا۔

چونکہ ان گناہوں کی یہی تاثیرات ہیں اور کوئی چیز بھی اپنا خلقی اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی لہذا ان گناہوں کے وہی اثرات ہوں گے جو اوپر بیان کئے گئے۔ آگ پر انگلی رکھ کر لاکھ چلائیے۔ مگر انگلی ضرور جل جائے گی۔ کیونکہ آگ کی تاثیر ہی جلا دینا ہے۔

واضح رہے کہ ان گناہوں کا یہ عذاب صرف دنیاوی عذاب ہے جو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ باقی آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے اور وہ عذاب جہنم ہے۔

○

نبی کا علم ماکان و مایکون

حدیث نمبر ۲۲

عَنْ عَمْرِو بْنِ اَخْطَبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمًا نِ الْفَجْرَ وَصَعِدَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَخَطَبَنَا حَتّٰی حَضَرَتِ الظُّھْرُ فَنَزَلَ فَصَلّٰی ثُمَّ صَعِدَ الْمِنْبَرَ فَخَطَبَنَا حَتّٰی حَضَرَتِ الْعَصْرُ ثُمَّ نَزَلَ فَصَلّٰی ثُمَّ صَعِدَ الْمِنْبَرَ حَتّٰی غَرَبَتِ الشَّمْسُ فَاَخْبَرَنَا بِمَا ھُوَ کَائِنٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ قَالَ فَاَعْلَمُنَا اَحْفَظُنَا۔

(مشکوٰۃ باب المعجزات ص ۵۴۳)

ترجمہ: حضرت عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ایک دن ہم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھائی اور منبر پر چڑھ گئے اور ظہر کی نماز تک خطبہ پڑھتے رہے۔ پھر اُترے اور نماز پڑھ کر پھر منبر پر چڑھ گئے اور خطبہ دیتے رہے۔ یہاں تک کی عصر کی نماز کا وقت آگیا پھر اُترے اور نماز پڑھی۔ پھر منبر پر چڑھ گئے اور سورج ڈوبنے تک خطبہ پڑھتے رہے تو (اس دن بھر کے خطبہ میں) ہم لوگوں کو حضور نے تمام ان چیزوں اور باتوں کی خبر دے دی جو قیامت تک ہونے والی ہیں۔ تو ہم صحابہ میں سب سے بڑا عالم وہی ہے۔ جس نے سب سے زیادہ اس خطبہ کو یاد رکھا ہے۔

حضرت عمرو بن اخطب

اس حدیث کے راوی حضرت عمرو بن اخطب رضی اللہ

تعالیٰ عنہ ہیں۔ یہ انصاری ہیں اور ان کی کنیت "ابو زید" ہے۔ اور محدثین کے نزدیک ان کی کنیت ان کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت سے غزوات میں شریک جہاد رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ محبت اور پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ اور ان کی خوبصورتی کے لیے دعا فرمائی۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ ان کی سو برس کی عمر ہو گئی تھی۔ مگر سر اور داڑھی کے چند ہی بال سفید ہوئے تھے اور آخری عمر تک چہرے کا حسن و جمال باقی رہا۔ (اکمال)

شرح حدیث

۱: یہ حدیث مسلم شریف میں بھی ہے۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر سے غروب آفتاب تک بجز ظہر و عصر پڑھنے کے برابر دن بھر خطبہ ہی میں مشغول رہے اور سامعین سنتے رہے اور اس خطبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک کے ہونے والے تمام واقعات تمام چیزوں اور تمام باتوں کی سامعین کو خبر دے دی۔ اور صحابہ میں سے جس قدر زیادہ اس خطبہ کو یاد رکھا۔ اتنا ہی بڑا وہ عالم شمار کیا جاتا تھا۔

۲: یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے کہ قیامت تک کے کروڑوں واقعات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دن بھر کے خطبہ میں بیان فرما دیا۔ صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خداوند عالم نے یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ آپ گھوڑے پر زین کسنے کا حکم دیتے تھے اور سائیس گھوڑے کی زین باندھ کر درست کرتا تھا۔ اتنی دیر میں آپ ایک ختم "زبور شریف" کی تلاوت کر لیتے تھے تو حضور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات کے جامع ہیں اگر دن بھر میں قیامت تک کے تمام احوال و واقعات کو بیان فرما دیں۔ تو اس میں کونسا تعجب کا مقام ہے؟

مسائل حدیث

اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

۱: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند عالم الغیب و الشہادۃ نے

جسطرح بہت سے معجزانہ کمالات سے نوازا۔ اور تمام انبیاء اور رسولوں میں آپ کو ممتاز فرما کر "سید الانبیاء" اور "افضل الرسل" بنایا۔ اسطرح علمی کمالات کا بھی آپ کو وہ کمال بخشا کہ "ماکان وما یکون" یعنی روز ازل سے قیامت تک کے تمام علوم کا خزانہ آپ کے سینۂ نبوت میں بھر دیا۔ چنانچہ اس مضمون کی بہت سی آیات و احادیث ہم نے اپنی کتاب "قرآنی تقریریں" میں تحریر کر دی ہیں یہاں بھی دو حدیثوں کا ترجمہ پڑھ لیجئے۔ (مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے کہ

۱: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنے رب عزوجل کو بہترین صورت میں دیکھا تو اس نے مجھ سے فرمایا کہ اوپر والی جماعت کس چیز میں بحث کر رہی ہے؟ تو میں نے عرض کیا کہ یا اللہ تو ہی اس کو زیادہ جاننے والا ہے پھر خداوند عالم نے اپنی (قدرت کی) ہتھیلی کو میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دیا۔ تو میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان میں پایا۔ اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے۔ سب کو میں نے جان لیا۔ (مشکوٰۃ باب المساجد ص۷۰)

۲: اللہ عزوجل نے میرے لیے دُنیا کو اٹھا کر اس طرح میرے سامنے پیش فرما دیا کہ میں تمام دنیا کو۔ اور اُس میں قیامت تک جو کچھ بھی ہونے والا ہے۔ ان سب کو اسطرح دیکھ رہا ہوں جس طرح میں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں۔ (زرقانی علی المواہب جلد ۷، ص۲۳۴)

۳: جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم "افضل الخلق" ہیں۔ اسی طرح آپ "اعلم الخلق" بھی ہیں کہ تمام جن و انس اور ملائکہ کے علوم سے بڑھ کر آپ کا علم ہے۔ یہاں تک کہ حضرت علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قصیدہ بردہ میں فرمایا کہ ؎

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا
وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

یعنی یا رسول اللہ! دُنیا اور اس کی سوکن (یعنی آخرت) یہ دونوں آپ کی سخاوت کے ثمرات میں سے ہیں اور "لوح و قلم کا علم" آپ کے علوم کا ایک جزو ہے!

واللہ تعالیٰ اعلم!

∴ ∴ ∴

نعت خوانی کا اہتمام

حدیث نمبر ۲۳

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضَعُ لِحَسَّانَ مِنْبَرًا فِي الْمَسْجِدِ يَقُوْمُ عَلَيْهَا قَائِمًا يُفَاخِرُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ يُنَافِحُ وَيَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ حَسَّانَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ مَا فَاخَرَ اَوْ فَاخَرَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ ۔ (مشکوٰۃ باب البیان والشعر ص۴۱۰)

ترجمہ: حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان کے لیے مسجد نبوی میں منبر رکھتے تھے اور حضرت حسان اس پر چڑھ کر کھڑے کھڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے بارے میں فخریہ اشعار پڑھتے۔ یا حضور کی طرف سے مشرکین کی ہجو کا جواب دیتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب تک حسان میری طرف سے مدافعانہ جواب دیتے یا میرے بارے میں فخریہ اشعار پڑھتے رہتے ہیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام ان کی مدد فرماتے رہتے ہیں۔

حضرت عائشہ اس حدیث کو روایت کرنے والی اُمّ المومنین حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نورِ نظر اور دُختر نیک اختر ہیں۔ ان کی والدہ کا نام "اُمّ رومان" ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے دسویں سال شوال کے مہینے میں ہجرت سے تین سال قبل بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے مکہ میں نکاح فرمایا اور شوال ۲ھ میں مدینہ منورہ کے اندر کاشانۂ نبوت میں داخل ہو گئیں اور نو برس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مشرف رہیں۔ اُمّہات المومنین میں سب سے زیادہ بارگاہِ رسالت میں محبوب ترین تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

کسی بیوی کے لحاف میں میرے اوپر وحی نہیں اتری مگر حضرت بی بی عائشہ جب میرے ساتھ بستر نبوت پر سوتی ہیں تو اس حالت میں بھی مجھ پہ وحی نازل ہوتی ہے۔

فقہ و حدیث کے علم میں ان کا درجہ بہت ہی بلند ہے۔ دو ہزار دو سو دس حدیثیں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں ان کی روایت کی ہوئی حدیثوں میں سے ایک سو چوہتّر حدیثیں ایسی ہیں جو بخاری و مسلم دونوں کتابوں میں ہیں اور چون حدیثیں ایسی ہیں جو صرف بخاری شریف میں ہیں اور اڑسٹھ حدیثیں وہ ہیں جن کو صرف مسلم نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق کا بیان ہے کہ حضرت بی بی عائشہ ہمیشہ روزانہ تہجّد پڑھنے کی پابند تھیں اور حضرت عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ فقہ و حدیث کے علوم کے علاوہ میں نے حضرت بی بی عائشہ سے بڑھ کر کسی کو اشعارِ عرب کا جاننے والا بھی نہیں پایا۔ آپ کے شاگردوں میں صحابہ اور تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت ہے۔
۱۷ ار رمضان شب سہ شنبہ ۵۷ھ یا ۵۸ھ میں مدینہ منوّرہ کے اندر وفات پائی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کی وصیت کے مطابق رات میں لوگوں نے آپ کو جنۃ البقیع کے قبرستان میں دوسری امہات المومنین کی قبروں کے پہلو میں دفن کیا۔ (اکمال و حاشیہ اکمال وغیرہ)

حضرت حسّان بن ثابت

یہ دربارِ رسالت کے خاص الخاص شاعر اور مدّاحِ رسول ہیں ان کی کنیت ابوالولید ہے

ان کے والد کا نام "ثابت" اور ان کے دادا کا نام "منذر" اور پر دادا کا نام "حرام" ہے اور ان چاروں کے بارے میں ایک تاریخی لطیفہ ہے کہ ان چاروں کی عمریں ایک سو بیس برس کی ہوئیں۔ جو عجائبات عالم میں سے ہے۔ (حاشیہ بخاری بحوالہ کرمانی ج ۲ صہ ۵۹۴)

حضرت حسّان کی ایک سو بیس برس کی عمر میں سے ساٹھ برس جاہلیت میں اور ساٹھ برس اسلام میں گزرے۔ یہ انصار کے "قبیلہ خزرج" سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ شعراءِ عرب میں بہت مشہور ہیں۔ بلکہ "ابوعبیدہ" نے یہاں تک فرمایا کہ عرب کے شہری شاعروں میں یہ سب سے اونچے درجہ کے شاعر ہوئے ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ

کے دورِ خلافت میں ۴۰؁ھ سے قبل آپ کی وفات ہوئی۔ (اکمال)

فوائد و مسائل

۱: یہ بخاری شریف کی حدیث ہے۔ یہ حدیث اُن وہابیوں اور دیوبندیوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔ جو ہم سُنیوں کی محفلِ میلاد شریف یا نعت خوانی، کی مجالس کا مذاق اڑاتے ہیں اور ہم پر پھبتیاں کستے رہتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ لوگ جتنی دیر تک میلاد شریف پڑھتے یا نعت خوانی کرتے رہتے ہیں۔ اتنی دیر تک قرآن شریف کی تلاوت کریں۔ ہم کہتے ہیں کہ تلاوتِ قرآن کے اجر و ثواب پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر خدا کے لیے علماء دیوبند کا کوئی بڑے سے بڑا "محدث" مجھ کو بتا تو دے؟ کہ کیا تلاوت قرآن کے لیے بھی کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اہتمام فرمایا کہ کسی قاری یا حافظ کے لیے خاص طور پر مسجد نبوی میں منبر بچھایا ہو اور وہ قاری یا حافظ جب قرآن پڑھ رہا ہو۔ تو حضور نے اس کو یہ فرما کر داد دی ہو کہ جبریل اس کی مدد کر رہے ہیں؟

۲: مجھے امید ہے کہ اگر یہ لوگ بخاری کی اس حدیث کو دیدۂ عبرت سے دیکھیں گے اور ان میں نور سعادت کی ادنیٰ سی کرن بھی ہوگی تو انشاء اللہ تعالیٰ ان کے سینوں کے بند دروازے کھُل جائیں گے۔ اور وہ میلاد شریف اور نعت خوانی کی اہمیت کا اعتراف کر کے یا تو خود بھی ان محفلوں کو سنت سمجھ کر ان میں شرکت کرنے لگیں گے یا کم از کم ان محفلوں کی برائی اور مذاق اڑانا چھوڑ دیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ ان کے دلوں پر شقاوت کی مہر ہی لگ چکی ہوگی۔ جب تو یہ حدیث کیا؟ پوری حدیثوں کے دفتر اور پورا قرآن بھی ان کے لیے ذریعۂ ہدایت نہیں بن سکتا ۔

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ "خضر" از حیواں تشنہ می آرد سکندر را

* * *

دُنیا نگاہِ نبوتؐ میں

حدیث نمبر ۲۴

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِىْ جَسَدِهٖ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَكَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَالِىْ وَالدُّنْيَا مَا اَنَا وَالدُّنْيَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَ ۔

(مشکوٰۃ کتاب الرقاق صہ ۴۴۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر سو کر جب اُٹھے۔ تو آپ کے جسم مبارک پر چٹائی کا نشان پڑ گیا تھا۔ تو عبداللہ بن مسعود نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کاش آپ ہم لوگوں کو حکم فرماتے کہ ہم لوگ آپ کے لیے بچھونا بچھا دیتے اور آپ کی راحت کا سامان کر دیتے تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ مجھے دنیا سے کیا مطلب؟ میری اور دنیا کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی سوار کسی درخت کے سایہ میں (کچھ دیر) بیٹھ جاتا ہے پھر اُس درخت کو چھوڑ کر چل دیتا ہے۔

فوائد و مسائل

۱: اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

۲: اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے بے رغبتی، عیش و آرام سے نفرت اور متواضعانہ زندگی کی ایک ایسی تصویر نظر آتی ہے کہ اس کے تصور ہی سے ہم

دنیا داروں کے قلب پر چوٹ لگتی ہے کہ اللہ۔ اللہ! دونوں عالم کے سردار محبوب پرور دگار، حضور احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم ایک کھرّی، کھُردری چٹائی پر بغیر بچھونے کے سوتے تھے۔ یہاں تک کہ چٹائی کی تیلیوں سے محبوبِ خدا کے جسمِ نازک پر نشان پڑ جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اس روح فرسا منظر کی تاب نہ لا سکے۔ بلبلا اُٹھے اور چٹائی پر بچھونا بچھا دینے کی تمنا ظاہر کی۔ تو شہنشاہِ کونین کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ مجھ کو دنیا کے عیش و آرام سے کیا مطلب؟ اور مجھے دنیا سے کیا تعلق؟ میری دُنیاوی زندگی کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے کوئی سوار سفر میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف جا رہا ہے راستے میں کوئی سایہ دار درخت مل گیا۔ تو وہ تھوڑی دیر کے لیے اس درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ پھر اُس درخت کو چھوڑ کر چل دیا۔ یہی مثال دنیا کی ہے کہ ہم سب عالمِ آخرت کے مسافر ہیں اور زمانے کے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہیں۔ عالمِ آخرت کو جاتے ہوئے یہ عالمِ دنیا ایک سایہ دار درخت کی طرح راستے میں مل گئی ہے۔ اس سایلے میں چند دن بیٹھ کر۔ پھر اس کو چھوڑ کر اپنی منزل مقصود یعنی عالمِ آخرت کی طرف روانہ ہو جانا ہے تو جس طرح سائے دار درخت کے سائے میں بیٹھنے والا مسافر نہ وہاں پلنگ بچھاتا ہے نہ بچھونا بچھاتا ہے۔ نہ مکان بناتا ہے نہ کوئی عیش و آرام کا سامان کرتا ہے۔ اسی طرح میں بھی اس دنیا میں بجز بقدر ضرورت سامان کے عیش و آرام کا کوئی ساز و سامان پسند نہیں کرتا۔

۳: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امیرانہ زندگی بالکل ہی پسند نہیں تھی۔ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں کہ میں بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کروں۔ میں تو خدا کا رسول اور خُدا کا بندہ ہوں۔ میں ایک بندے کی طرح کھاتا ہوں۔ ایک بندے کی طرح اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ ایک بندے کی طرح زندگی بسر کرتا ہوں۔

۴: آپ کو مسکینوں کی زندگی سے بے حد محبت تھی۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ اس طرح دعا مانگا کرتے تھے کہ

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ　　یا اللہ تو مجھ کو ایک مسکین کی زندگی عنایت فرما
اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ احْشُرْنِیْ　　اور ایک مسکین کی موت عطا فرما اور مسکینوں کی

فِی زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔ جماعت میں میرا حشر فرما

یہ دُعا سن کر اُمّ المومنین حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا صبر نہ کر سکیں۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اس طرح کی دُعا کیوں مانگ رہے ہیں تو ارشاد فرمایا

اِنَّھُمْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ قَبْلَ اَغْنِیَاءِ ھِمْ بِاَرْبَعِیْنَ خَرِیْفًا یَا عَائِشَۃُ لَا تَرُدِّی الْمِسْکِیْنَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ یَا عَائِشَۃُ اَحِبِّی الْمَسَاکِیْنَ وَقَرِّبِیْھِمْ فَاِنَّ اللہَ یُقَرِّبُكِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

(مشکوٰۃ باب فضل الفقراء ص ۴۴۷)

یقیناً یہ (مسکین) لوگ مالداروں سے چالیس برس پہلے جنّت میں داخل ہو جائیں گے۔ اے عائشہ! تو مسکین کو خالی ہاتھ مت لوٹا دے کچھ نہ ہو تو کھجور کا ایک ٹکڑا ہی دے دے۔ اے عائشہ! تو مسکینوں سے محبّت کر اور ان کو اپنے قرب میں جگہ دے۔ تو اللہ تعالیٰ تجھ کو قیامت کے دن اپنا قُرب عطا فرمائے گا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر صحابی کہتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جذبۂ محبت میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ؛

کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّكَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ۔

(مشکوٰۃ باب الامل والحرص ص ۴۵۰)

تم دُنیا میں ایک پردیسی کی طرح رہو۔ بلکہ ایک راستہ چلنے والے مسافر کی طرح رہو۔ اور اپنی ذات قبر والوں (مُردوں) میں سے شمار کرو۔

مطلب یہ ہے کہ پردیسی آدمی، یا راستہ چلنے والا مسافر جس طرح بہت ٹھاٹھ باٹھ اور ساز و سامان سے گراں بار نہیں ہوتا۔ اور پردیس یا راستہ سے کوئی زیادہ دلچسپی اور لگاؤ نہیں رکھتا۔ اسی طرح تم بھی دنیا کے ساز و سامان سے زیادہ تعلق اور قلبی لگاؤ مت رکھو۔

۵؛ واضح رہے کہ جن خاص خاص صحابہ کو حضور نے مسکینوں کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا یہ کوئی وجوبی حکم نہیں تھا۔ بلکہ یہ استحبابی حکم تھا۔ یہ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ

علیہ وسلم کا کمالِ کرم ہے کہ خود تو مسکینوں کی زندگی گزاری ۔ مگر اپنی اُمت کو ہر قسم کی حلال راحتوں اور جائز ساز و سامان رکھنے کی اجازت عطا فرمائی ہے ۔ اور اس بارے میں اپنی امت کو قرآن کا یہ فرمان بار بار سُنایا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ یعنی اے محبوب ! آپ لوگوں کو سُنا دیجئے کہ کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کیا ہے ۔ جو اُس نے اپنے بندوں کے نفع اُٹھانے کیلئے پیدا فرمائی ہے اور کون ہے جو حلال اور پاکیزہ رزق کو حرام ٹھہرائے ؟

بہر حال ہر قسم کے آرام و راحت کے سامانوں کو بشرطیکہ وہ حلال اور جائز ہوں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس کے استعمال کرنے اور اس سے نفع اٹھانے کی اجازت دی ہے ۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت رکھنا اور برتنا جائز ہے ۔ بس شرط یہی ہے کہ وہ حلال اور جائز ہو ۔

واللہ اعلم !

جنّت کی گارنٹی

حدیث نمبر ۲۵

عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
قَالَ اِضْمَنُوْا لِیْ سِتًّا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَضْمَنْ لَکُمُ الْجَنَّۃَ
اُصْدُقُوْا اِذَا حَدَّثْتُمْ وَاَوْفُوْا اِذَا وَعَدْتُّمْ وَاَدُّوْا اِذَا
ائْتُمِنْتُمْ وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَکُمْ وَغُضُّوْا اَبْصَارَکُمْ
وَکُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ۔

(مشکوٰۃ باب حفظ اللسان ص۴۱۵)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اپنی طرف سے میرے لیے چھ چیزوں کی ذمہ داری قبول کرلو تو میں تمہارے لیے جنّت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ (۱) جب بات کرو تو سچ بولو (۲) جب کوئی وعدہ کرو اس کو پورا کرو (۳) جب کوئی امانت تم کو سونپی جائے تو اس امانت کو ادا کرو (۴) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو (۵) اپنی نگاہوں کو نیچی رکھو (۶) اپنے ہاتھوں کو (ہر ظلم و معصیت سے) روکے رکھو۔

فوائد و مسائل

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے "جَوَامِعُ الْکَلِمِ" کا معجزہ عطا فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ و کلمات دیکھنے میں تو بہت ہی مختصر ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنے دامنوں میں اتنے کثیر معانی و مطالب

کا خزانہ رکھتے ہیں کہ گویا ایک کوزہ میں پورا سمندر سمایا ہوا ہے۔ چنانچہ اس حدیث میں بظاہر تو کل چھ ہی چیزیں مذکور ہیں۔ مگر یہ چھ چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان ان پر مکمل طور سے عامل ہو جائے تو وہ چھ ہزار بلکہ چھ لاکھ بلکہ تمام گناہوں سے بچ جائے گا اور تمام نیکیوں کا خزانہ اُس کے نامہ اعمال میں جمع ہو جائے گا۔

مثلاً پہلی چیز کہ زبان سے سچ کے سوا کچھ نہ بولنا، ظاہر ہے کہ زبان تمام قولی گناہوں کا منبع اور تمام قولی عبادتوں کا سرچشمہ ہے۔ اب جو شخص اس کی ذمہ داری لے لے کہ وہ سچ کے سوا زبان سے کچھ نہ بولے گا۔ تو سُن لیجئے کہ توحید، رسالت، قیامت اور تمام عقائد اسلام کا اقرار، تلاوتِ قرآن تمام درود وظائف اچھی باتوں کا حکم دینا، بُری باتوں سے روکنا۔ غرض ہر چھوٹی بڑی قولی عبادت "سچ" ہی تو ہے۔ لہٰذا سچ بولنے والا تمام قولی عبادتوں پر عامل ہوگا اور کفر و شرک، بہتان، فریب، وعدہ خلافی، جھوٹی شہادت، غلط باتیں، جھوٹی خبریں غرض زبان سے صادر ہونے والے ہزاروں لاکھوں گناہ یہ سب "جھوٹ" ہی تو ہیں۔ تو غور کر لیجئے ایک سچ بولنے کا عہد کر لینے میں تمام قولی عبادتوں کے کرنے اور تمام قولی گناہوں سے بچنے کی گارنٹی ہے۔

اسی طرح ہر وعدہ کو پورا کرنا۔ یہ بھی ایک ہی عمل ایسا ہے کہ اس کے اندر ہزاروں نیکی کرنے اور ہزاروں گناہوں سے بچنے کی ضمانت ہے۔ ظاہر ہے کہ بندوں کا وعدہ دو قسم کا ہے ایک اللہ سے وعدہ ایک مخلوق سے وعدہ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان سے روزِ ازل میں اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا ؕ کے ذریعہ اپنی ربوبیت کا اقرار، اور اپنی فرماں برداری کا وعدہ لے لیا ہے اور پھر یہ بھی حکم دیا ہے کہ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ کہ اے بندو! تم اپنے تمام وعدوں کو پورا کرو۔ تو اب نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ غرض تمام اعمالِ صالحہ کا کرنا یہ اللہ سے کیے ہوئے وعدوں کا پورا کرنا ہے۔ اور اللہ کے کسی حکم سے نافرمانی کرنا یہ وعدہ خلافی کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک وعدہ پورا کرنے کی ذمہ داری میں تمام حقوق اللہ کی ادائیگی داخل ہے۔

اسی طرح مخلوق سے وعدہ پورا کرنے میں مخلوق کو راحت پہنچانا۔ اس کی

حاجتوں کو پوری کرنا، مومنوں کا دل خوش کرنا۔ غرض ہزاروں نیک کام اس کے ضمن میں ہو جاتے ہیں اور وعدہ خلافی میں مومنوں کی ایذا رسانی ان کی حاجتوں کو روکنا وغیرہ وغیرہ سینکڑوں ہزاروں مفاسد و معاصی جمع ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح شرمگاہ کی حفاظت میں زنا، لواطت اور ان کے دواعی وغیرہ سے بچنا۔ اور جائز طریقے سے صاحب اولاد ہونا ہے۔ اگر خداوند تعالیٰ نیک و صالح اولاد عطا فرما دے۔ تو وہ ماں باپ کے لیے دنیا و آخرت میں بہتری کا بہترین سامان ہیں۔

اسی طرح خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے نگاہ نیچی رکھنا، اس میں سینکڑوں نیکیوں پر عمل اور سینکڑوں گناہوں سے بچنا ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آنکھ دل کا جھروکہ ہے نگاہ پڑنے ہی سے دل میں نیکی یا بدی کا خیال آتا ہے۔ پھر دل اگر سُدھرا۔ تو سارا بدن سُدھرا۔ اور دل اگر بگڑا تو سارا بدن بگڑا۔ اب سمجھ لیجئے کہ خدا کے محارم سے نگاہ نیچی رکھنے میں کتنی نیکیوں پر عمل اور کتنے گناہوں سے بچت ہو جائے گی۔

اسی طرح امانتوں میں خیانت سے پرہیز کرنے میں بھی۔ چونکہ خدا کی امانتیں سب ادائے امانت میں داخل ہیں اس لیے امانتوں کے ادا کرنے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سب پر عمل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اپنے ہاتھوں کو تمام مظالم اور گناہوں سے روکے رہنے میں ظاہر ہے کہ کتنی نیکیاں ہوں گی؟ اور کتنے گناہوں سے انسان بچ جائے گا۔

بہر حال یہ چھ چیزیں بہت ہی اہم ہیں اور ہر مومن کو ان کی پابندی لازم ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چھ باتوں پر عمل کرنے والوں کے لیے جنت میں داخل ہونے کی گارنٹی دی ہے۔

لطیفہ میں ایک مرتبہ دھوراجی کے اندر ندی کے میدان میں وعظ بیان کر کے اپنی قیامگاہ "مدرسہ مسکینیہ" میں جا رہا تھا تو جامع مسجد کے چھتے کے نیچے ایک مست فقیر نے مجھ کو مخاطب کر کے یہ کہا کہ اے مولوی! اتنا لمبا

وعظ مت کہا کر۔ بس لوگوں سے اتنا کہدے کہ" زبان اور فلاں کی حفاظت کرو" اُس وقت تو میں ہنس کر چل دیا۔ اور اس جُملہ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن جب دورۂ حدیث پڑھاتے ہوئے بخاری شریف کی اس حدیث پر نظر پڑی کہ

مَنْ يَّضْمَنْ لِيْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ

(مشکوٰۃ باب حفظ اللسان ص۴۱۱)

جو شخص میرے لیے اپنے دونوں کلّوں کے درمیان والی چیز (زبان) اور دونوں ٹانگوں کے درمیان والی چیز (شرمگاہ) کا ضامن ہو جائے میں اس کے لیے جنّت کا ضامن ہوں۔

تو میری آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی اُس مست فقیر نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا وہ فرمانِ رسول ہی کی ایک دلچسپ تعبیر تھی کہ (زبان اور فلاں کی حفاظت کرو)

○

راستوں کا حق

حدیث نمبر ۲۶

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
قَالَ اِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ بِالطُّرُقَاتِ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ
مَالَنَا مِنْ مَّجَالِسِنَا بُدٌّ نَتَحَدَّثُ فِیْھَا قَالَ فَاِذَا اَبَیْتُمْ اِلَّا
الْمَجْلِسَ فَاَعْطُوا الطَّرِیْقَ حَقَّہٗ قَالُوْا مَا حَقُّ الطَّرِیْقِ
یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ غَضُّ الْبَصَرِ وَکَفُّ الْاَذٰی وَرَدُّ السَّلَامِ
وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّھْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ۔

(بخاری کتاب الاستیذان صہ ۹۲)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ راستوں پر بیٹھنے سے بچو۔ تو صحابہ نے کہا کہ یا رسول اللہ راستوں میں بیٹھنے سے تو ہم لوگوں کو چارہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ان ہی جگہوں میں تو ہم لوگ بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔ تو حضور نے فرمایا کہ اگر تم لوگ راستوں میں بیٹھنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ تو بیٹھو۔ لیکن راستے کا حق دیتے رہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! راستہ کا حق کیا ہے؟ تو ارشاد فرمایا کہ (۱) نیچی نگاہ رکھنا (۲) کسی کو ایذا نہ دینا (۳) لوگوں کے سلام کا جواب دینا (۴) اچھی باتوں کا حکم دینا (۵) بری باتوں سے منع کرنا۔

فوائد

۱: علامہ قسطلانی نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم کہ "تم لوگ راستوں پر بیٹھنے سے بچو" یہ حکم وجوبی نہیں تھا۔ بلکہ استحبابی تھا۔ کیونکہ اگر یہ حکم وجوبی ہوتا۔ تو صحابہ اس کے جواب میں ہرگز ہرگز کبھی یہ نہ کہتے کہ ہمارے لیے تو راستوں پر بیٹھنے سے چارہ ہی نہیں ہے"۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے کہ اچھا۔ تم لوگ بیٹھو۔ تو راستوں کا حق دیتے رہو۔ (حاشیہ بخاری ص ۹۲۰ ج دوم)

۲: مذکورہ بالا پانچوں باتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ کا حق قرار دیا ہے۔ اور مومن پر از روئے شریعت ہر حق والے کا حق ادا کرنا واجب ہے۔ لہذا جو لوگ راستوں پر بیٹھیں۔ ان پر واجب ہے کہ ان پانچوں باتوں پر عمل کریں۔

۳: بلا ضرورت راستوں پر بیٹھنا اگرچہ راستہ کے حقوق ادا کرنے کی صورت میں حرام اور گناہ تو نہیں۔ مگر چونکہ یہ کوئی اچھی خصلت بھی نہیں ہے۔ لہذا حتی الوسع مسلمانوں کو اس سے پرہیز ہی کرنا چاہیئے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کہ بے پردگی، بلکہ عریانی و برہنگی فیشن بن چکی ہے۔ سڑکوں اور راستوں پر لوگوں کا بیٹھنا بہت سے مفاسد کا پیش خیمہ ہے۔ لہذا اس سے خاص طور پر پرہیز کرنا چاہیئے۔

۴: راستوں کے پانچوں حقوق کی قدرے تفصیل یہ ہے۔ اول نگاہوں کو نیچی رکھنا۔ چونکہ راستوں پر عورتیں اور مرد بھی گزریں گے۔ اس لیے بیٹھنے والے پر از روئے حکم شریعت واجب ہے کہ نہ غیر محرم عورتوں پر نظر ڈالیں۔ نہ لوگوں کے ان عیوب کو دیکھیں جن کو راستہ چلنے والے لوگوں سے چھپانا چاہتے ہیں۔ مثلاً کوڑھی یا سفید داغ والے، یا لنگڑے لولے کو گھور گھور کر بار بار نہ دیکھیں کہ اس سے ان لوگوں کی دل آزاری ہوگی۔

دوم۔ کسی کو ایذا نہ دینا۔ یعنی اس طرح راستوں پر نہ بیٹھا کریں کہ راستہ تنگ ہو جائے اور گزرنے والوں کو ایذا پہنچے۔ یوں ہی راستہ چلنے والوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ راستہ چلنے والوں کی تحقیر اور عیب جوئی نہ کریں۔ سفر کرنے والوں کی جاسوسی نہ کریں کہ کون کون؟ کہاں کہاں؟ جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے؟ غرض راستوں پر بیٹھنے والے

اپنے کسی قول و فعل سے گذرنے والوں کو تکلیف اور ایذا نہ پہنچائیں۔

سوم ۳۔ ہر گزرنے والے کے سلام کا جواب دیتے رہیں۔

چہارم ۴۔ راستہ چلنے والوں کو اچھی باتیں بتلاتے رہیں۔ مثلاً آگے راستہ میں کوئی خطرہ ہو۔ یا راستہ میں کوئی رکاوٹ ہو۔ تو اس سے راستہ چلنے والوں کو آگاہ کرتے رہیں راستہ بھولنے والوں یا ناواقفوں کو راستہ بتلاتے رہیں اور راستہ چلنے کے شرعی آداب لوگوں کو بتاتے اور سکھاتے رہیں۔

پنجم ۵۔ خلافِ شریعت اور بری باتوں سے لوگوں کو منع کرتے رہیں۔ تاکہ راستہ چلنے والے سفر میں کوئی خلافِ شریعت کام نہ کرنے پائیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

○

جنّت کا باغ

حدیث نمبر ۲۷

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا بَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّیَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِیْ عَلٰی حَوْضِیْ۔

(بخاری ا باب فضل ما بین القبر والمنبر ص ۱۵۹)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین کا جو حصّہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان میں ہے۔ وہ جنّت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔

فوائد و مسائل

ا: علامہ عینی نے فرمایا کہ اس حدیث کی صحیح روایت یہی ہے۔ بعض روایتوں میں اس جگہ "ما بین حجرتی و مصلای" کا لفظ آیا ہے اور بعض روایتوں میں "ما بین قبری و منبری" بھی وارد ہوا ہے۔ بہرحال تینوں روایتوں کا مدّعا اور حاصل ایک ہی ہے۔

۲: یہ حدیث مختلف سندوں کے ساتھ بخاری شریف میں چند جگہ مذکور ہے صاحب مجمع البحار اور علاّمہ عینی و علامہ کرمانی وغیرہ نے اس حدیث کی شرح میں تحریر فرمایا ہے کہ یہاں دو احتمال ہیں۔ حدیث میں یا تو معنی حقیقی مراد ہیں یا مجازی۔ معنی حقیقی تو یہ ہیں کہ یہ زمین کا ٹکڑا درحقیقت جنت ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اور یہ بعینہ ایک باغ بنا کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ اور یہ میرا منبر بعینہ حوض کوثر پر رکھ دیا جائے گا۔
اور معنی مجازی یہ ہیں کہ اس زمین کے ٹکڑے میں عبادت کرنا جنّت میں جانے

کا سبب ہے اور اس منبر کے پاس عبادت کرنا حوض کوثر سے سیراب ہونے کا ذریعہ ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں یہ فرمایا کہ "ذکر کے حلقے جنت کے باغ ہیں" کہیں یہ فرمایا کہ "جنت تلوار کے سایے کے نیچے ہے" یعنی "ذکر الٰہی کے حلقوں میں بیٹھ کر عبادت کرنا۔ دخولِ جنت کا سبب ہے۔" "اور تلوار کے سایے میں جہاد کرنا یا شہید ہونا جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے۔"

یا معنی مجازی یہ ہیں کہ زمین کا یہ ٹکڑا جنت کے باغ کے مثل ہے کہ جس طرح جنت کے باغ میں ہر وقت رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا رہتا ہے ۔ اسی طرح اس زمین کے ٹکڑے میں بھی بہت زیادہ رحمتِ الٰہی نازل ہوا کرتی ہے ۔

لیکن حضرت علامہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہ العزیز نے "لمعات شرح مشکوٰۃ" میں تحریر فرمایا کہ علماء محققین کا یہی قول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام حقیقی معنی پر محمول ہے اور اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا حقیقی معنوں میں جنت کے باغ کا ایک ٹکڑا ہے اور قیامت کے دن زمین کا یہ ٹکڑا بعینہٖ جنت میں پہنچا دیا جائے گا اور روئے زمین کے دوسرے ٹکڑوں کی طرح یہ برباد نہیں کیا جائے گا ۔ (حاشیہ بخاری ج ا ص ۱۵۹)

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے اور علامہ ابن حجر نے بھی یہ فرمایا ہے کہ "وھذا علیہ الاکثر" یعنی اکثر علماء کا یہی مسلک ہے ۔ (مرقاۃ)

اور حقیقت بھی یہی ہے ۔ کیونکہ اگر اس کلام کے معنی مجازی مراد ہوں یعنی اس زمین کے ٹکڑے کو جنت کا باغ کہنا اس معنی کر کے ہو کہ "اس میں عبادت کرنا جنت میں داخل ہونے کا سبب اور ذریعہ ہے" یا "یہ خیر و برکت میں مثل جنت کے ہے" تو پھر اس بات میں زمین کے اس ٹکڑے کی خصوصیت ہی کیا رہ جاتی ہے ؟ اس معنی میں تو ہر مسجد جنت کا باغ ہے ۔ ہر ذکر کی مجلس جنت کا باغ ہے ۔ ہر میدان جہاد جنت کا باغ ہے ۔ پھر مقام مدح میں خاص طور پر اس زمین کے ٹکڑے کو ذکر کرنے کا کیا فائدہ ؟

پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض عُلماء کرام نے اس حدیث سے ثابت کیا ہے کہ "مدینہ منورہ" تمام دنیا کے شہروں سے زیادہ افضل ہے (حاشیہ بخاری صہ۱۹) ظاہر ہے کہ یہ استدلال اُسی وقت درست ہوگا جب کہ اس کے حقیقی معنی مُراد لیے جائیں کہ مدینہ کا یہ ٹکڑا چونکہ جنت ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اور مدینہ منورہ کے سوا دنیا بھر کے کسی شہر میں بھی ایسا کوئی زمین کا ٹکڑا نہیں ہے۔ اس لیے مدینہ منورہ تمام شہروں سے اس خصوصیت کے لحاظ سے افضل و اعلیٰ ہے۔ ورنہ معنی مجازی کے لحاظ سے آپ پڑھ چکے کہ بہت سے مقامات اور جگہیں جنت کا باغ ہیں۔

اسی طرح علامہ خطابی نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کا مقصد لوگوں کو مدینہ منورہ کی سکونت پر ترغیب دلانا ہے۔ (حاشیہ بخاری صہ ۹۷۵)

ظاہر ہے کہ لوگوں کو مدینہ منورہ میں سکونت کی رغبت اُسی وقت زیادہ ہوگی۔ جب لوگ یہ سمجھیں گے۔ کہ واقعی حضور کے منبر اور قبرِ انور کے درمیان میں زمین کا ٹکڑا حقیقت میں اور حقیقی طور پر جنت کا باغ ہے۔ ورنہ محض اتنی سی بات سے کیا رغبت حاصل ہوگی؟ کہ وہاں عبادت کرنے سے جنّت ملے گی۔ یا وہاں جنّت جیسی خیر و برکت ہے۔ کیونکہ اتنی سی بات تو دُنیا میں اور بھی بہت سی جگہوں میں پائی جاتی ہے۔

بہر حال محققین کے قول کے مطابق اس حدیث کے یہی معنی راجح ہیں کہ ہر شخص کو یہ ایمان رکھنا چاہیئے کہ منبر اور قبرِ انور کے درمیان کی زمین واقعی، سچ مُچ اور حقیقت میں جنّت کا باغ ہے اور قیامت میں یہ زمین کا ٹکڑا مدینہ منورہ سے اٹھا کر جنّت میں پہنچا دیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

* * *

وسیلہ

حدیث نمبر ۲۸

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ كَانَ اِذَا قُحِطُوْا اِسْتَسْقٰی بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ اِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْكَ نَبِیِّنَا فَتَسْقِیْنَا وَ اِنَّا نَتَوَسَّلُ بِعَمِّ نَبِیِّنَا فَاسْقِنَا فَیُسْقَوْنَ۔

(بخاری ابواب الاستسقاء صہ ۱۳۷)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوتے تھے تو حضرت عباس بن عبد المطلب کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگا کرتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ یا اللہ! ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی کو وسیلہ بنایا کرتے تھے۔ اس وقت تو ہم کو بارش سے سیراب فرماتا تھا۔ اور اب ہم اپنے نبی کے چچا کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتے ہیں لہذا تو ہم کو سیراب فرمادے تو لوگ سیراب کر دیئے جاتے تھے۔ (یعنی بارش ہو جاتی تھی)۔

فوائد و مسائل

۱: بخاری شریف کی یہ حدیث کھلی ہوئی دلیل ہے کہ خدا سے دعا مانگتے وقت حضرات انبیاء و اولیاء اور دوسرے صلحاء امت کا وسیلہ پکڑنا۔ اور ان کے وسیلوں سے اپنی مرادوں کو بارگاہِ الٰہی سے طلب کرنا یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر تمام صحابۂ کرام کا اجماع و اتفاق ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ نماز استسقاء میں حضور امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہزاروں صحابہ دعا

میں شریک ہوتے رہے ہوں گے اور اس دُعا کو سنتے رہے ہوں گے۔ اگر خدانخواستہ وسیلوں کے ساتھ دُعاء مانگنا شرک یا گناہ ہوتا تو نہ حضرت امیر المومنین فاروق اعظم اس طرح دُعا مانگتے۔ نہ صحابہ اس دُعاء کو پسند کرتے۔ اگر بال برابر بھی یہ دُعاء خلاف شریعت ہوتی۔ تو ہزاروں صحابہ ہرگز ہرگز اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ ضرور حضرت فاروق اعظم کو ٹوک دیتے۔ مگر جب حضرت فاروق اعظم نے اس طرح دعا مانگی۔ اور تمام صحابہ نے اس دُعا کو پسند کر کے اس پر " آمین " کہا تو یہ اجماع ہو گیا کہ بلاشبہ اس طرح دُعا مانگنا جائز بلکہ مستحب ہے۔

۲: حضرت علامہ عینی نے تحریر فرمایا کہ " ابوصالح " کی روایت کردہ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ منبر پر کھڑا کیا اور پہلے خود اس طرح دعا مانگی کہ

اَللّٰهُمَّ اِنَّا تَوَجَّهْنَا اِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّكَ فَاسْقِنَا الْغَيْثَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنَ الْقَانِطِيْنَ۔	یا اللہ! ہم سب تیرے نبی کے چچا کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لہذا تو ہم لوگوں کو بارش سے سیراب فرمادے اور ہم کو ناامید نہ فرما۔

اس کے بعد حضرت فاروقِ اعظم نے حضرت عبّاس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابوالفضل! تم بھی دُعاء مانگو تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس طرح دُعاء مانگی کہ

اَللّٰهُمَّ لَمْ يُنْزَلْ بَلَاءٌ اِلَّا بِذَنْبٍ وَلَمْ يُكْشَفْ اِلَّا بِتَوْبَةٍ وَقَدْ تَوَجَّهَ بِيَ الْقَوْمُ اِلَيْكَ بِمَكَانِيْ مِنْ نَبِيِّكَ وَهٰذِهٖ اَيْدِيْنَا اِلَيْكَ بِالذُّنُوْبِ وَنَوَاصِيْنَا بِالتَّوْبَةِ فَاسْقِنَا۔	یا اللہ! ہر بلا گناہوں کے باعث ہی اتاری جاتی ہے اور بغیر توبہ کے کوئی بلا دفع نہیں کی جاتی ساری قوم میرے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوئی ہے کیونکہ مجھ کو تیرے نبی سے ایک خاص تعلق ہے۔ یہ ہمارے گناہگار ہاتھ اور ہماری توبہ کرنیوالی پیشانیاں تیرے حضور میں حاضر ہیں لہذا تو ہم لوگوں کو سیراب فرمادے۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی دُعاء کے بعد پہاڑوں کی طرح

بدلیاں ہر چہار طرف سے آگئیں اور خوب بارش ہوئی۔ یہاں تک کہ زمین سیراب ہو کر سرسبز و شاداب ہو گئی (حاشیہ بخاری ص ۱۳۷)

۳: حضرت فاروق اعظم نے اپنی اس دعاء میں یہ تصریح فرما دی کہ پہلے ہم تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنا کر دعاء مانگا کرتے تھے اور اب ہم تیرے نبی کے چچا کو وسیلہ بنا کر دعاء مانگتے ہیں۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ نبی اور غیر نبی، زندوں اور وفات پا جانے والوں، سب کو دعاؤں میں وسیلہ بنانا جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

○

تبرکات نبوّت

حدیث نمبر ۲۹

عَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ قَالَ قَدِمْتُ الْمَدِیْنَةَ فَلَقِیَنِیْ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ سَلَامٍ فَقَالَ لِیْ انْطَلِقْ اِلَی الْمَنْزِلِ فَاَسْقِیَكَ فِیْ قَدَحٍ شَرِبَ فِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ وَسَلَّمَ وَتُصَلِّیْ فِیْ مَسْجِدٍ صَلّٰی فِیْهِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَانْطَلَقْتُ مَعَهٗ فَاَسْقَانِیْ سَوِیْقًا وَاَطْعَمَنِیْ تَمْرًا وَصَلَّیْتُ فِیْ مَسْجِدِهٖ۔

(بخاری ج ۲ ص ۱۰۹۱)

ترجمہ: ابو بُردہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں مدینہ آیا۔ تو مجھ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے ملاقات کی۔ پھر فرمایا کہ تم گھر چلو میں تم کو اس پیالے میں کچھ پلاؤں گا جس پیالے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا تھا اور تم اُس مسجد میں نماز پڑھو گے۔ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ گیا۔ تو انہوں نے مجھ کو (اُس پیالہ میں) ستو پلایا۔ اور میں نے ان کی مسجد میں نماز پڑھی۔

حضرت ابو بُردہ ان کا نام عامر ہے۔ یہ بہت مشہور تابعی اور ایک مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں۔ یہ حدیث میں اپنے والد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ دوسرے جلیل القدر صحابہ کے شاگرد ہیں۔ قاضی شُریح کے بعد یہ کوفہ کے قاضی بنا دئے گئے تھے۔ مگر عبدالملک بن مروان کے گورنر حجاج بن یوسف ظالم نے ان کو معزول کر دیا۔ (اکمال)

حضرت عبداللہ بن سلام

بہت ہی نامور اور مشہور صحابی ہیں۔ یہ یہودیوں کے سب سے بڑے عالم اور توراۃ و انجیل کے بہت ہی ماہر تھے۔ مدینہ ہی کے باشندے تھے۔ مدینہ ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہودی ان کے بڑے دشمن تھے کیونکہ یہ یہودیوں کے اکثر خود ساختہ مسائل کے ڈھول کا پول کھول دیا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی بشارت دی تھی۔ سنہ ۴۳ھ کے سال مدینہ منورہ میں ان کا وصال ہوا۔ (اکمال)

فوائد و مسائل

۱: محدث عبدالرزاق نے اس حدیث کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبردہ کے والد حضرت ابوموسیٰ اشعری نے خاص طور پر ابوبردہ کو مدینہ منورہ حضرت عبداللہ بن سلام کی خدمت میں علم حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے مرحبا (خوش آمدید) کہا اور پھر فرمایا کہ تم میرے مکان پر چلو۔ میں تمہاری اس شان کے ساتھ مہمان نوازی کرونگا کہ میں تم کو اُس مقدس پیالے میں کچھ پلاؤں گا جس میں حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی نوش فرمایا تھا۔ اور تم میری مسجد میں نماز پڑھو گے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔ چنانچہ جب ابوبُردہ ان کے مکان پر گئے۔ تو انہوں نے کھجور کھلا کر اسی متبرک پیالے میں ستو گھول کر پلایا۔

تبرکاتِ نبوت کی تعظیم

۲: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کی تعظیم و تکریم، اور ان کے ساتھ والہانہ محبت صحابہ کرام کا مقدس طریقہ ہے۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت صحابہ کرام ہر اس چیز کی تعظیم و احترام کرتے تھے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نسبت و تعلق ہو۔ بخاری شریف میں مذکور ہے کہ حضرت محمد بن سیرین مشہور باکرامت تابعی محدث نے "عبیدہ" محدث سے کہا کہ میرے پاس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند موئے مبارک ہیں۔ جو حضرت انس رضی صحابی کے گھر والوں نے مجھے عطا کئے ہیں۔ یہ سُن کر "عبیدہ" نے کہا کہ اگر میرے پاس ان مقدس بالوں میں سے ایک بال بھی ہوتا۔ تو وہ میرے نزدیک

تمام دنیا و مافیہا سے بڑھ کر محبوب ہوتا۔

حضرت انسؓ صحابی کا بیان ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں اپنے سر کے بال اتروائے تو سب سے پہلے حضرت ابو طلحہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس بالوں کو بطور تبرک لے لیا۔

(بخاری باب الماء الذی یغسل بہ شعر الانسان ج ا ص ۲۹)

اس طرح صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں کو بھی انتہائی معظم و متبرک سمجھتے تھے حضرت امیر المومنین ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسماء کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک "جُبّہ" تھا۔ وہ بیماروں کو اس کا دھوون پلاتی تھیں۔ اور شفا حاصل ہوتی تھی۔ مسلم شریف میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنی ٹوپی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مُوئے مُبارک کو تبرکاً رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہر جنگ میں انہی مقدس بالوں کی برکت سے مجھے فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے! بخاری شریف میں متعدد جگہ یہ حدیث ہے کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غُسالۂ وضو کو لوٹ لیتے تھے۔ اور برکت کے لیے اپنے چہروں پر ملتے تھے۔ اسی طرح حضور کے لعاب دہن اور کھنکھار کو بھی صحابہ زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے۔ بلکہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے چہروں اور آنکھوں پر مل لیا کرتے تھے۔

حضرت انس صحابی نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری موت کے بعد میرے بدن اور کفن میں وہی خوشبو لگائی جائے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ ملا ہوا ہے۔ بخاری ج ۲ باب من زار قوماً فقال عندہم ص ۹۲۹) اس طرح کی بہت سی حدیثوں کو علامہ شوکانی نے "نیل الاوطار" میں ذکر فرما کر یہ تحریر کیا ہے کہ:

قَدِ اسْتَدَلَّ الْجُمْهُوْرُ بِصَبِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى جَابِرٍ وَتَقْرِيْرِهٖ لِلصَّحَابَةِ عَلَى التَّبَرُّكِ بِوَضُوْئِهٖ۔ (نیل الاوطار ج ا ص ۱۹)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر پر اپنے وضو کا پانی ڈالا۔ اور صحابہ نے جو حضور کے غُسالۂ وضو کو اپنے جسموں پر ملا اور حضورؐ نے منع نہیں فرمایا تو اس سے جمہور علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضورؐ کے وضو کے پانی کو تبرک بنانا چاہیئے۔

بہرکیف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام تبرکات کی تعظیم کرنی چاہیئے اور ان کو متبرک سمجھ کر ان کا ادب واحترام کرنا چاہیئے۔

موئے مُبارک کی زیارت

لہٰذا اس زمانے میں بھی جن بالوں اور جبّوں کے متعلق مشہور ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور جُبّہ شریفہ ہے ہرگز ہرگز نہ اس کی تکذیب کرنی چاہیئے نہ توہین و بے ادبی۔ بلکہ انتہائی والہانہ عقیدت کے ساتھ ان کو تبرک سمجھ کر زیارت کرنی چاہیئے۔

کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو واقع میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک ہوں گے یا نہیں۔ اگر واقع میں جیسا کہ مشہور ہے وہ حضور ہی کے مقدس بال ہیں۔ جب تو ظاہر ہے کہ ان کی تکذیب یا توہین و تنقیص سے آدمی یقیناً قہر قہار و غضب جبار میں گرفتار ہو جائے گا کہ توبہ۔ نعوذ باللہ وہ حضور کے مقدس بال کی توہین کے وبال میں پڑ گیا اور اگر واقع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک بال نہیں ہیں۔ بلکہ لوگوں نے خواہ مخواہ مشہور کر دیا ہے تو بھی اس کی تعظیم و تکریم کرنے میں کوئی دینی نقصان نہیں۔ بلکہ نیک نیتی اور عقیدت کی بنا پر ثواب ہی کی امید ہے کیونکہ عمل کے ثواب کا دارومدار نیّت پر ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نیتوں کا جاننے والا اور ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

لطیفہ

اس سلسلے میں احمد آباد کا ایک واقعہ میری زندگی کی ایک ناقابلِ فراموش داستان ہے۔ بارہویں شریف کے مہینے میں عام طور پر احمد آباد میں بہت سی جگہوں پر موئے مبارک زیارت کرائی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ غالباً "دلی چکلہ" یا کسی دوسرے محلہ میں کسی جگہ موئے مبارک کی زیارت کا جلسہ تھا۔ لوگ زیارت کر رہے تھے۔ کہ ناگہاں ایک وہابی عقیدہ کا نوجوان اکڑ گیا اور اہلِ محلہ سے مطالبہ کیا کہ اس بال کے موئے مبارک ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ میں کس طرح یہ تسلیم کر لوں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مقدس بال شریف ہے؟ اس پر بہت زیادہ "تُو تُو" "مَیں مَیں" ہوئی۔ چنانچہ محلہ کے لوگ اس نوجوان کو لے کر میرے پاس دارالعلوم شاہ عالم میں آئے۔ اس نوجوان نے بڑی بے باکی، اور بے ادبی کے ساتھ مجھ سے گفتگو شروع کی اور مجھ سے بھی یہی مطالبہ کیا کہ آپ ثابت کیجئے کہ شہر احمد آباد میں

جتنی جگہوں پر موئے مبارک ہیں۔ وہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے "بال شریف" ہیں اس کا کیا ثبوت ہے؟

اس وقت قدرتی طور پر مجھے یہ جواب سمجھ میں آیا کہ میں نے اس سے انتہائی نرمی اور محبت کے لہجہ میں پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے کہا کہ "عبد القادر" پھر میں نے پوچھا تمہارے والد کا کیا نام ہے؟ تو اس نے کہا کہ "عبد اللہ بھائی" میں ایک منٹ خاموش رہا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم عبد اللہ بھائی کے بیٹے ہو؟ اس نے کہا "جی ہاں" میں پھر ایک منٹ خاموش رہا۔ اور میں نے پھر اس سے پوچھا کہ "کیا تم "عبد اللہ بھائی" ہی کے بیٹے ہو؟ میرے اس سوال پر وہ بھڑک اٹھا۔ اور چلا کر کہا کہ کیا آپ بار بار مجھ سے یہی سوال کرتے ہیں کہ "تم عبد اللہ بھائی ہی کے بیٹے ہو؟ میں چپ رہا۔ جب اُس کا غصہ بہت تیز ہو گیا۔ تو میں نے کہا کہ "میں نہیں مانتا کہ تم عبد اللہ بھائی کے بیٹے ہو۔" تمہارے پاس کون سا ایسا ثبوت ہے کہ تم عبد اللہ بھائی کے بیٹے ہو؟ "جب تک تم اس کا ثبوت نہیں پیش کرو گے۔ میں ہرگز ہرگز تم کو عبد اللہ بھائی کا بیٹا نہیں مان سکتا۔ یہ سُن کر وہ خاموش ہو گیا۔ اب میں نے ڈانٹتے ہوئے بتڑپ کر کہا کہ "بولتے کیوں نہیں؟ کیا ثبوت ہے کہ تم عبد اللہ بھائی کے بیٹے ہو؟" پھر بھی وہ چپ رہا۔ مگر اس کا چہرہ اتر گیا۔ میں نے جب محسوس کر لیا۔ کہ یہ اب لاجواب ہو چکا ہے۔ تو میں نے خود اس سے کہا کہ بھائی! اس کے سوا تمہارے پاس اور کیا ثبوت ہے؟ کہ تمہاری ماں نے یہ بتایا ہے کہ تم عبد اللہ ہی کے بیٹے ہو۔ تمہاری ماں کے سوا تمہارے عبد اللہ کا بیٹا ہونے پر دنیا بھر میں نہ کوئی گواہ ہے نہ کوئی ثبوت۔ مگر تم محض اپنی ماں کے کہنے پر عبد اللہ کے باپ ہونے کا اتنا پکا یقین رکھتے ہو۔ کہ خانہ کعبہ کے اندر سر پر قرآن رکھ کر بھی تم یہی کہو گے کہ میں عبد اللہ کا بیٹا ہوں۔ تو عزیز من! فقط ایک عورت کے کہہ دینے سے تم نے مان لیا۔ اور یقین کر لیا کہ تمہارا باپ عبد اللہ ہے۔ تو آج سینکڑوں برس سے ہزاروں، لاکھوں انسان یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ احمد آباد کے تمام موئے مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بال شریف ہیں تو اگر ہم لوگ اس بات کا یقین کر لیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے مقدس بال ہیں۔ تو اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟ ایک عورت تو جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔

مگر سینکڑوں برس کے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے بارے میں یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب جھوٹے ہیں؟

میری یہ جذبات سے بھری ہوئی گفتگو سن کر وہ اس قدر متاثر ہوا کہ رو پڑا یہاں تک کہ وہ میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا اور کہا کہ حضور! میں توبہ کرتا ہوں کہ اب کبھی بھی میں ان مقدس بالوں کی تکذیب یا توہین و تنقیص نہیں کروں گا۔ اور مجھے یقین ہوگیا کہ واقعی ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی بات جھوٹ اور غلط نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد وہ نوجوان کہنے لگا کہ حضور! لیکن ایک شبہ میرے دل میں اور ہے۔ جو کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ اس کے بارے میں بھی حضور کچھ روشنی ڈالیں۔ تو میں بہت ہی ممنون ہوں گا۔ شاید میرا یہ شبہ بھی دور ہو جائے۔ میں نے کہا کہ وہ کیا ہے؟ تو کہنے لگا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا سے تشریف لے گئے ساڑھے تیرہ سو برس سے زائد ہو گئے۔ اس طویل مدت اور اتنے لمبے زمانے میں بال تو بال کوئی ہڈی بھی اپنی اصلی حالت پر بدستور قائم نہیں رہ سکتی کیا کوئی بال ساڑھے تیرہ سو برس تک بغیر گلے سڑے "جیوں کا تیوں" اپنی اصلی حالت پر باقی رہ سکتا ہے؟

میں نے چمکار کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا! تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ میرے اور تمہارے بال ساڑھے تیرہ سو برس کو کیا؟ برس دو برس بھی ایک حالت پر سلامت اور باقی نہیں رہ سکتے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ فَنَبِیُّ اللّٰہِ حَیٌّ یُّرْزَقُ (مشکوٰۃ باب الجمعہ ص۱۲۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام فرما دیا ہے کہ وہ نبیوں کے بدن کو کھائے۔ اللہ کے سب نبی زندہ ہیں اور ان کو روزی دی جاتی ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ لہٰذا ان کے مقدس جسم کا گلنا سڑنا محال ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال شریف حضور ہی کے جسم کا ایک جزو ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضور کے ان بالوں کو بھی یہ فضیلت عطا فرما دی

ہے کہ وہ حضور کے جسم مبارک کی طرح کبھی سڑ گل نہیں سکتے۔ تم دیکھ لو کہ سینکڑوں برس سے احمد آباد کے ان تمام مقدس بالوں کا ایک ہی حالت پر قائم رہنا یہ بھی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے موئے مبارک ہیں۔ ورنہ اگر کسی دوسرے کے یہ بال ہوتے۔ تو کبھی کے سڑ گل کر فنا ہو چکے ہوتے۔ یہ سن کر وہ نوجوان پھر آبدیدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ خدا کی قسم! میرے تمام شبہات دور ہو گئے اور مجھ کو یقین کامل ہو گیا کہ "یہ موئے مبارک بالکل اصلی ہیں"۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لوگ بھی بہت خوش ہوئے اور وہ نوجوان بھی وہابیت سے متنفر ہو کر پختہ سنی ہو گیا۔

فالحمد للہ علی ذالک۔

تصویریں

حدیث نمبر ۳۰

عَنْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِی الْحَسَنِ قَالَ کُنْتُ عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ اِذْ جَاءَہٗ رَجُلٌ فَقَالَ یَا ابْنَ عَبَّاسٍ اِنِّیْ رَجُلٌ اِنَّمَا مَعِیْشَتِیْ مِنْ صَنْعَۃِ یَدِیْ وَاِنِّیْ اَصْنَعُ ھٰذِہِ التَّصَاوِیْرَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا اُحَدِّثُكَ اِلَّا مَا سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ مَنْ صَوَّرَ صُوْرَۃً فَاِنَّ اللّٰہَ مُعَذِّبُہٗ حَتّٰی یَنْفُخَ فِیْہِ الرُّوْحَ وَلَیْسَ بِنَافِخٍ فِیْھَا اَبَدًا فَرَبَا الرَّجُلُ رَبْوَۃً شَدِیْدَۃً وَاصْفَرَّ وَجْھُہٗ فَقَالَ وَیْحَكَ اِنْ اَبَیْتَ اِلَّا اَنْ تَصْنَعَ فَعَلَیْكَ بِھٰذَا الشَّجَرِ وَکُلِّ شَیْءٍ لَیْسَ فِیْہِ رُوْحٌ ۔

(مشکوٰۃ باب التصاویر)

ترجمہ: سعید بن ابی الحسن راوی ہیں انہوں نے کہا کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا کہ ناگہاں ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا کہ اے ابن عباس! میں ایسا آدمی ہوں کہ میری روزی میرے ہاتھ کی کاریگری سے چلتی ہے اور میں ان تصویروں کو بناتا ہوں۔ تو ابن عباس نے فرمایا کہ تم سے وہی حدیث بیان کرتا ہوں جس کو میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے میں نے حضور کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص تصویر بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس وقت تک عذاب دیگا۔ جب تک کہ وہ اس تصویر میں روح نہ پھونک دے اور وہ اس تصویر میں کبھی بھی روح نہیں پھونک سکے گا۔ تو اس آدمی نے لمبا سانس کھینچا اور (خوف سے) پیلا پڑ گیا۔ پھر ابن عباس نے فرمایا کہ تیرا ناس ہو۔ اگر تو اس کے بنانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تو ان درختوں اور بے جان والی چیزوں کی تصویر بنایا کر۔

حضرت سعید بن ابی الحسن رح

اس حدیث کے راوی سعید بن ابی الحسن بصری تابعی محدث ہیں اور علم حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباس رض اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد رشید ہیں اور ان کے شاگردوں کی فہرست میں قتادہ اور عون جیسے حدیثوں کے پہاڑ ہیں۔ ۱۰۹ھ میں ان کا وصال ہوا (اکمال)

شرح حدیث

یہ بخاری شریف کی حدیث ہے۔ اس حدیث کا مطلب بالکل ہی واضح ہے کہ جاندار چیزوں کی تصویر بنانے والے کو خداوند قہار وجبار یہ فرماکر عذاب دے گا کہ تم اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں روح پھونک کر ان کو زندہ کرو جب تک تم ان تصویروں میں روح نہیں پھونکو گے عذاب میں گرفتار رہو گے اور ظاہر ہے کہ وہ ان تصویروں میں کبھی بھی روح نہیں پھونک سکے گا۔ اس لیے وہ اس وقت تک عذاب میں مبتلا رہے گا۔ جب تک اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو معاف فرماکر اس کو نہ بخش دے۔

فوائد ومسائل

۱: اس دورِ پُرفتن کی دینی مصیبتوں میں سے ایک بہت بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ ہر قسم کے سامانوں پر جاندار مخلوقات کی تصویریں عموماً نظر پڑتی ہیں۔ ایک طرف تو مسلم نوجوانوں کا یہ حال ہے کہ وہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں یا لیڈروں کی تصویروں سے اپنے مکانوں کو سجاکر ہر ہر کمرے کو بت خانہ بنائے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف جاہل صوفی کہلانے والوں کی یہ حرکت ہے کہ وہ بزرگوں کی کچھ اصلی کچھ فرضی تصویریں اپنے گھروں میں رکھے ہوئے ہیں۔ روزانہ ان پر ہار پھول چڑھاتے ہیں اور بعض ان تصویروں کے سامنے مراقبہ کرتے ہیں۔ جو سراسر گمراہی ہے۔ واضح ہے کہ ان تصویروں کا رکھنا، سخت حرام وناجائز اور گناہ کبیرہ ہے۔ لہٰذا علمائے کرام اور پابندِ شرع مشائخ کا فرض ہے کہ ان جاہل اور بدعتی صوفی بننے والے باباؤں کو ہمیشہ جھاڑتے، پھٹکارتے اور لتاڑتے رہیں اور عوام کو ان بے شرع لوگوں سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہیں اور جن گھروں میں بھی تصویریں ہوں۔ علماء کرام کو چاہیئے کہ ہرگز ہرگز نہ اُن گھروں میں

قیام کریں۔ نہ ان گھروں میں کھانا کھائیں۔ تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔

۲: کیمرہ یا قلم یا پنسل سے کسی جاندار مخلوق کی تصویر بنانا۔ یا بنوانا۔ یا خریدنا یا بیچنا یا گھر میں رکھنا یہ سب حرام اور گناہ ہے۔

۳: غیر جاندار چیزوں کی تصویریں بنانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

۴: حج فرض، یا تبلیغ اسلام یا حقوق العباد کی ادائیگی یا دوسرے ضروری دینی مقاصد کے لیے سفر کے پاسپورٹ پر تصویر لگانا بوجہ ضرورت اور مجبوری اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا جائے گا۔ بشرطیکہ تصویر لگانے والا اس سے راضی نہ ہو۔ اور بادلِ ناخواستہ مجبوری کی بنا پر تصویر بنواتا اور لگاتا ہو۔

زمین کے خزانے

حدیث نمبر ۳۱

عَنْ عُقْبَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ یَوْمًا فَصَلّٰی عَلٰی اَهْلِ اُحُدٍ صَلٰوتَهٗ عَلَی الْمَیِّتِ ثُمَّ انْصَرَفَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ اِنِّیْ فَرَطٌ لَّکُمْ وَاَنَا شَهِیْدٌ عَلَیْکُمْ وَاِنِّیْ وَاللّٰهِ لَاَنْظُرُ اِلٰی حَوْضِیَ الْاٰنَ وَاِنِّیْ اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ وَاِنِّیْ وَاللّٰهِ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمْ اَنْ تُشْرِکُوْا بَعْدِیْ وَلٰکِنْ اَخَافُ اَنْ تَنَافَسُوْا فِیْهَا ۝

(بخاری کتاب الحوض ج ۲ ص ۹۷۵)

ترجمہ: حضرت عقبہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن گھر سے باہر تشریف لے گئے اور "شہداء اُحد" کی قبروں پر اس طرح نماز پڑھی جیسے میت پر نماز پڑھی جاتی ہے۔ پھر پلٹ کر منبر پر رونق افروز ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ "میں تمہارا پیش رو" اور تمہارا گواہ ہوں اور میں خدا کی قسم اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں اور بے شک مجھ کو زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں اور میں بخدا یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو تم لوگوں کے بارے میں ذرا بھی یہ ڈر نہیں ہے کہ تم لوگ میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے۔ لیکن مجھے یہ خوف ہے کہ تم لوگ دنیا میں رغبت اور ایک دوسرے پر حسد کرو گے۔

حضرت عُقبہ عُقبہ بن عامر جُہنی صحابی ہیں۔ یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں مصر کے گورنر تھے۔ پھر گورنری سے معزول کر دیئے گئے اور مصر ہی میں ۵۸ھ کے سال ان کا وصال ہوا۔ صحابہ اور تابعین کی بہت

بڑی جماعت نے ان سے حدیثوں کی روایت کی ہے (اکمال)

فوائد و مسائل

اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد و مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

زیارت قبور

۱: حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہداء اُحد کی شہادت کے آٹھ سال بعد ان کی قبروں کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص زیارت کے قصد سے قبروں پر جانا خصوصاً شہدا و صالحین کی قبروں کی زیارت کرنی یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے۔

جو لوگ قبروں کی زیارت کے سفر کو شرک یا معصیت ٹھہراتے ہیں۔ وہ صراحۃً اس حدیث کی مخالفت کرتے ہیں اور سراسر گمراہی و بدعقیدگی کے وبال میں گرفتار ہیں۔ علامہ صاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت "وَابْتَغُوا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ" کی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے کہ

> اولیاء اللہ کے مقابر کی زیارت کرنے والے مسلمانوں کو اس خیال سے کافر کہنا کہ زیارت قبور غیر اللہ کی عبادت ہے۔ یہ بالکل کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت ہرگز ہرگز غیر اللہ کی عبادت نہیں ہے۔ بلکہ یہ اللہ کے بارے میں محبت رکھنے کی ایک نشانی ہے (صاوی ج ۱ ص ۲۴۵)

۲: اس حدیث میں (صلّٰی علٰی اھل احد صلوٰتہ علی المیت) کے بارے میں دو قول ہیں علامہ کرمانی نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نماز جنازہ میں جس طرح میت کے لیے دُعا پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شہداء اُحد کے لیے اُن کی قبروں کے پاس دعا مانگی!

لیکن دوسرے شارحینِ حدیث نے فرمایا کہ آپ نے پورے آٹھ برس کے بعد شہدائے اُحد کی قبروں پر ٹھیک اسی طرح نماز جنازہ ادا فرمائی جس طرح آپ دوسری اموات کی نماز جنازہ پڑھتے تھے۔ اس صورت میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے شمار کیا جائیگا کہ آٹھ برس کے بعد کسی میّت کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ دوسرے لوگوں کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔

۳: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر یہ فرمایا کہ (انی فرط لکم) کہ میں تم لوگوں کے لیے "پیش رو" ہوں (فرط) عربی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو کہیں جانے والی جماعت سے پہلے ہی پہنچ کر۔ اس جماعت کے تمام ضروریات کا انتظام مہیا کیا کرتا ہے۔ حضور نے اپنے بارے میں فرمایا کہ میں تم تمام امتیوں کے لیے "فرط" ہوں۔ یعنی تم سے پہلے عالم آخرت میں پہنچ کر تمہاری شفاعت اور تمہاری مغفرت کا تمہارے آنے سے پہلے ہی انتظام کروں گا۔

۴: اس حدیث میں (وانا شہید علیکم) فرماکر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ اعلان فرمادیا کہ میں تم تمام اُمتیوں کا قیامت میں گواہ ہوں۔ یعنی تم لوگوں کے ایمان اور اعمال و افعال کے متعلق میں خداوندِ عالم جل جلالہٗ کے حضور گواہی دوں گا۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ صاف ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک آنیوالے اپنے ایک ایک "اُمتی" اور ان کے اعمال و افعال سے باخبر ہیں اور سب کچھ اُن کے علم میں ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بغیر دیکھے اور بغیر جانے کسی بات کی گواہی دینا شرعاً حرام و ناجائز ہے۔ اس لیے یہ کیونکہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بے جانے قیامت میں اپنی امت کے لیے گواہی دیں گے۔

۵: اس حدیث میں حضور نے یہ بھی فرمایا کہ (وانی واللہ لانظر الی حوضی الآن) یعنی خدا کی قسم! میں اس وقت اپنے حوض (کوثر) کو دیکھ رہا ہوں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ نبوت اتنی معجزانہ تھی کہ عالم دنیا میں اپنے منبر پر رونق افروز ہوتے ہوئے۔ عالمِ آخرت میں جنّت کے اندر اپنے حوضِ کوثر کو دیکھ لیا۔ اس حدیث سے یہ مسئلہ آفتابِ نیم روز کی طرح روشن ہوگیا کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات، تمام مخلوقات میں بے مثل و بے مثال ہے۔ اسی طرح آپ کے ہر ہر عضو شریف کی طاقتیں اور توانائیاں بھی بے مثل و بے مثال ہیں۔ لہٰذا حضور کے اعضاء شریفہ کی معجزانہ طاقتوں کو اگر کوئی اپنے اعضاء کی طاقتوں پر قیاس کرے۔ تو یہ بہت بڑی گمراہی اور جہالت ہے۔ کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم؟ اور کہاں ہم عیوب و نقائص کے

پُتلے ؟ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

۶: اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (وانی اعطیت مفاتیح خزائن الارض) یعنی زمین کے خزانوں کی کنجیاں مجھے عطا کی گئیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ خزانے کی کنجیوں کو کسی کے ہاتھ میں دے دینا۔ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے ؟ تمام دنیا جانتی ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے تو "تالا کنجی" فلاں کے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو اپنے خزانوں میں تصرف کا مالک و مختار بنا دیا ہے۔ اب قابل غور یہ بات ہے کہ "زمین کے خزانوں" سے یہاں کیا مراد ہے ؟ تو بعض شارحین حدیث نے یہ فرمایا کہ اس سے مراد آپ کی وہ فتوحات ہیں جو آپ کو یا خلفاء راشدین یا ان کے بعد کے اُمراء وسلاطین کو حاصل ہوئیں کہ سلطنتِ روم و فارس وغیرہ کے تمام خزانے مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ "انتم تنتثلونها" یعنی زمین کے خزانے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا کئے گئے تم لوگ اس کو نکال رہے ہو اور حاصل کر رہے ہو۔

اور بعض شارحین حدیث نے فرمایا کہ ان خزانوں کے علاوہ سونا، چاندی، ہیرے جواہرات، لوہا، تانبا، پیتل وغیرہ قسم قسم کی دھاتیں اور تیل، پٹرول وغیرہ کے خزانے بھی مراد ہیں کہ سب خزانے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت حضور کی اُمت کو مل گئے۔

۷: فقیر راقم الحروف کا خیال ہے کہ شارحین حدیث نے زمین کے خزانوں کے بارے میں اسلامی فتوحات یا زمین کی قسم قسم کی کانوں کا جو تذکرہ کیا ہے۔ یہ مثال کے طور پر ہے۔ ورنہ "خزائن الارض" صرف یہی سب اور اتنی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ "خزائن الارض" میں وہ چیزیں داخل ہیں۔ جو زمین میں سے نکلتی ہیں۔ اس بنا پر تمام جمادات، نباتات اور حیوانات، سبھی زمین کے خزانے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر قسم کی سبزیاں، غلے، پھل، قسم قسم کے ذائقے اور غذائیں، طرح طرح کی دوائیں، یہ سب زمین ہی میں سے نکلتی ہیں۔ جانداروں کے نطفے بھی زمین سے نکلی ہوئی غذاؤں ہی کی پیداوار ہیں۔ کیونکہ اگر جاندار زمین سے نکلی ہوئی غذائیں

نہ کھاتے تو ان کی زندگی کہاں ہوتی ؟ ان کے جسم میں خون کہاں سے پیدا ہوتا ؟ اور بلا خون کے نطفہ اور منی کہاں سے پیدا ہوتی ؟ غرض تمام جانور اور جان دار اور ان جانداروں کی زندگانی کا سارا سازو سامان زمین ہی سے نکلتا ہے۔ اس لحاظ سے "خزائن الارض" میں تمام حیوانات، بناتات، جمادات، داخل ہیں بلکہ زمین و آسمان کے درمیان کی کائنات بھی زمین کے خزانوں میں شامل ہیں۔ کیونکہ بدلی، بارش، اولے، قوسِ قزح، ہالہ، رعد برق، غرض تمام فضائی کائنات، زمین ہی سے نکلے ہوئے "بخارات" کی پیداوار ہیں۔

لہٰذا اب اس حدیث شریف کا یہ مطلب ہوا کہ زمین کی ساری کائنات اور تمام مخلوقات جو سب زمین کے خزانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سب میں تصرف کا مالک و مختار بنا دیا ہے۔

جب حدیث کے اندر لفظ "خزائن الارض" میں کوئی تقیید یا تخصص موجود نہیں ہے بلکہ جمع کی اضافت استغراق کا افادہ کر رہی ہے۔ تو پھر اس صورت میں ظاہر ہے کہ یقیناً اس لفظ کو اس کے عموم ہی پر باقی رکھا جائے گا۔ اور اس کے عام ہونے ہی کی صورت میں یہ حدیث مقامِ مدح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان رہے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبؐ کو کل کائناتِ زمین کا مختار بنا دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

۸ : حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ (وَاِنِّیْ وَاللّٰہِ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمْ اَنْ تُشْرِکُوْا بَعْدِیْ) یعنی خدا کی قسم میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے اپنے بعد میں تمہارے مشرک ہو جانے کا کوئی خوف نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں غیب کی خبر دے رہے ہیں کہ میری امت قیامت تک مشرک نہیں ہو گی۔ اور اس امت میں شرک نہیں پھیلے گا۔

اگرچہ بعض حدیثوں میں یہ آیا ہے کہ اس وقت تک قیامت نہیں قائم ہو گی۔ جب تک کہ "قبیلۂ دوس" کی عورتیں بتوں کا طواف نہ کریں گی۔ ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح دی جائے گی۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ حضور کی ساری امت ایک دم مشرک ہو جائے۔ ایسا تو قیامت تک نہیں ہو گا۔ لیکن کہیں کہیں کچھ بستیوں والے

یا کچھ افراد شرک میں مبتلا ہو جائیں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ "قبیلۂ دوس" کی عورتوں میں شرک پھیل جائے گا۔ جیسا کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے۔

۹: حدیث کا آخری ٹکڑا (ولکنی اخاف علیکم ان تنافسوا فیھا) کا یہ مطلب ہے کہ مجھے یہ خوف اور ڈر ہے کہ میری امت والے دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو کر اس طرح دُنیا کی رغبت میں پھنس جائیں گے کہ ایک دوسرے سے بغض و حسد کریں گے اور جنگ و جدال، کشت و قتال کا بازار گرم کریں گے۔ چنانچہ بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جیسے اگلی امتیں دنیا کی رغبتوں میں پھنس کر ہلاک ہو گئیں۔ اسی طرح میری امت بھی دنیاوی رغبتوں کا شکار ہو کر ہلاکت کے غار میں گر پڑے گی۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں برس پہلے جو غیب کی خبر دی تھی۔ آپ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی کہ صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کے بعد دنیاوی رغبتوں کے باعث اُمتِ رسول میں تحاسد و تباغض کا دَور دورہ اس شدت اور تیزی کے ساتھ رونما ہو گیا کہ مسلمانوں کے درمیان جنگ و جدال اور کُشت و قتال کا بازار گرم ہو گیا اور روز بروز مسلمانوں کا یہ مرض اس تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے کہ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ آئندہ قومِ مسلم کا کیا حال ہو گا؟ مسلمانوں کے ہر طبقے میں حرص و ہوس اور بغض و حسد کی بیماری اس طرح پھیل گئی ہے کہ "مسلم معاشرہ" اقوام عالم کی نگاہوں میں اس قدر ذلیل و خوار ہو چکا ہے کہ غیر مسلموں کا بچہ بچہ "مسلمانوں کے کرتوت اور کردار سے متنفر و بیزار نظر آ رہا ہے۔ گھر گھر میں سامانوں اور جائدادوں کے جھگڑوں کی کش مکش اور دنیاوی اقتدار کی جنگ سے "مسلم معاشرہ" جنگ و جدال کی اماجگاہ اور کشت و قتال کا میدانِ کارزار بنا ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ نظروں کے سامنے ہے۔ کہ مسلم قوم ہلاکت و تباہی کے ایسے عمیق غار میں گرتی چلی جا رہی ہے کہ اب نُصرتِ خداوندی کے سوا اس قوم کی صلاح و فلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے فیا اسفاہ و یا حسرتاہ۔

علما کی دست بوسی

حدیث نمبر ۳۲

عَنْ زَارِعٍ وَكَانَ فِي وَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ قَالَ لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَّوَاحِلِنَا فَنُقَبِّلُ يَدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِجْلَهُ رَوَاهُ اَبُوْ دَاوٗدَ۔

(مشکوٰۃ باب المصافحہ ص ۴۰۲)

ترجمہ: حضرت زارع جو قبیلہ عبد القیس کے نمائندوں میں شامل تھے، فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ میں آئے۔ تو ہم لوگ جلدی جلدی اپنی سواریوں سے اُتر پڑے اور ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دینے لگے۔

حضرت زارِع زارع بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور قبیلہ عبد القیس کے جو نمائندے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ یہ اس وفد میں شامل تھے۔ محدثین نے ان کو "بصری محدثین کی فہرست میں داخل کیا ہے اور ان کی حدیثیں عام طور پر بصری محدثین ہی کے پاس رہیں۔ (اکمال)

فوائد و مسائل ۱: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ علماء و مشائخ اور صلحاءِ اُمّت کے ہاتھ پاؤں کو عقیدت و محبّت سے چومنا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبد الحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ

اگر علماء اور بادشاہ کے ہاتھ کو ان کے علم اور دینداری نیز دین کی تعظیم کی نیّت سے کوئی چوم لے۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے ہاں اگر کسی دنیاوی غرض کے لالچ میں ایسا کرے تو یہ سخت مکروہ ہے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۲۳)

۲: علماء کا ہاتھ چومنے پر طعنہ زنی کرنے والوں کے لیے اس حدیث اور شیخ محقق کی تصریح میں یقیناً ہدایت کا بہت بڑا سامان ہے۔ بشرطیکہ ان کے دلوں پر عناد و انکار کی مہر نہ لگ چکی ہو۔

مگر حقیقت تو یہ ہے کہ علماء کرام کے اعزاز و وقار اور ان کے اثر و اقتدار کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھنے والے کبھی بھی اور کہیں بھی اور کسی طرح بھی اپنی زبانوں کو اعتراض کی گندگی سے نہیں بچائیں گے۔ کیونکہ "حسد" ایک ایسی آگ ہے کہ تمام سمندروں کا پانی بھی اس آگ کو نہیں بجھا سکتا۔ اور اس آگ کے بجھنے کی اس کے سوا کوئی صورت ہی نہیں ہے کہ حاسد کی زندگی کا چراغ ہی بجھ جائے۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بڑے پتے کی بات لکھ دی ہے کہ ؎

بمیر تا برہی اے حسود! کیں رنجے است
کہ از مشقت آں جز بمرگ نتواں رست

یعنی اے حسد کرنے والے! تو مرجا! کیونکہ تیرا یہ حسد ایک ایسا رنج ہے کہ تو اس کی مشقت سے بغیر مرے ہوئے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

⁂ ⁂ ⁂

تین منجیات تین مہلکات

حدیث نمبر ۳۳

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مُنْجِیَاتٌ وَثَلٰثٌ مُهْلِکَاتٌ فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ فَتَقْوَی اللهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِی الرِّضَا وَالسَّخَطِ وَالْقَصْدُ فِی الْغِنٰی وَالْفَقْرِ وَ اَمَّا الْمُهْلِکَاتُ فَهَوًی مُتَّبَعٌ وَشُحٌّ مُطَاعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَهِیَ اَشَدُّهُنَّ ۔

(مشکوٰۃ باب الغضب و الکبر صد ۴۳۴)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین (خصلتیں) نجات دلانے والی اور تین (خصلتیں) ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔ نجات دلانے والی (خصلتیں) یہ ہیں۔ (۱) ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرنا (۲) خوشی و ناراضگی میں حق بولنا (۳) مالداری اور فقیری میں درمیانی چال چلنا۔ اور ہلاکت میں ڈالنے والی (خصلتیں) یہ ہیں (۱) نفسانی خواہشوں کی پیروی کرنا (۲) بخیلی کی اطاعت کرنا (۳) اپنی ذات پر گھمنڈ کرنا۔ اور یہ ان تینوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔

فوائد و مسائل ۱: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مطلب بالکل

واضح ہے۔ کہ تین خصلتیں وہ ہیں جو دنیا اور آخرت کے عذابوں سے نجات دلانے والی ہیں اور تین خصلتیں ایسی ہیں جو انسان کو دنیا و آخرت دونوں جگہوں میں ہلاک کر دینے والی ہیں۔

نجات دلانے والی خصلتوں کی فہرست یہ ہے؛

۱۔ تقویٰ ظاہر و باطن میں خدا سے ڈرنا۔ ظاہر ہے کہ خوفِ الٰہی تمام نیکیوں کے کرنے اور تمام گناہوں سے بچنے کا سرچشمہ ہے۔ جب تنہائی اور مجمع، ظاہر و باطن ہر جگہ، ہر حال میں بندہ خدا سے ڈرتا رہے گا۔ تو یقیناً وہ ہر جگہ اور ہر حال میں وہی کام کرے گا۔ جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو۔ اور ان تمام باتوں سے بچے گا جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ حال ہوگا۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ ضرور دونوں جہان کے عذاب سے نجات پا جائے گا۔

۲۔ حق بولنا اسی طرح جو شخص اس خصلت کا عادی بن جائے گا کہ وہ خوشی کی حالت میں ہو یا ناراضگی کی حالت میں، ہر جگہ، ہر حال میں وہ حق بات ہی بولے گا۔ تو وہ گناہ کی باتوں سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ اور اپنی اس حق گوئی پر جہاد کے ثواب کا مستحق ہوگا۔ لہٰذا انشاء اللہ تعالیٰ وہ عذاب دارین سے نجات پا جائیگا۔

۳۔ درمیانی چال اسی طرح امیری اور فقیری دونوں حالتوں میں جو درمیانی چال چلے گا تو ظاہر ہے کہ وہ دونوں حالتوں میں گناہوں سے بچے گا۔ جس کا ثمرہ دونوں جہان کے عذابوں سے بچنا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

ہلاک کر دینے والی خصلتوں کی فہرست یہ ہے:

۱۔ خواہشِ نفس کی پیروی نفس امارہ کی پیروی یہی تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ قرآن مجید نے بہت ہی واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا کہ "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ" یعنی "نفس امارہ" کا یہ کام ہی ہے کہ وہ انسان کو ہمیشہ گناہوں کا حکم دیتا رہتا ہے۔ اور معصیتوں پر ابھارتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ "معصیت اور گناہ" ہلاکت کے سوا اور کس چیز کا سبب بن سکتی ہے؟

بخیلی کی اطاعت[۲]

اسی طرح بخیلی کی اطاعت بھی ہر قسم کی نیکیوں سے روکنے والی ہے اور بخیلی کو دنیا و آخرت میں کہیں بھی آرام و راحت نصیب نہیں ہو سکتا۔ دُنیا میں بھی وہ طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھاتا ہے اور آخرت میں تو جہنّم کے سوا اس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔

بَخِیل اَر بُوَد زاہد بحر و بر — بہشتی نباشد بحکمِ خبر

یعنی بخیل اگرچہ خشکی اور سمندر ہر جگہ کا زاہد بن جائے۔ پھر بھی وہ حدیث کے فرمان سے "جنّتی" نہیں ہو گا۔

اپنی ذات پر گھمنڈ[۳]

اسی طرح اپنی ذات پر گھمنڈ یعنی اپنے کو سب سے اچھا سمجھنا یہ بھی عذاب دارین کا سبب ہے اور یہ تو وہ ہولناک گناہ اور خوفناک معصیت ہے کہ ابلیس اسی " اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ " کے گھمنڈ میں مارا گیا۔ اور ذلیل کر کے بہشت سے نکالا گیا اور قیامت تک خالقِ کائنات اور اس کی تمام مخلوقات کی لعنتوں میں گرفتار رہے گا۔

غیبت زنا سے بدتر

حدیث نمبر ۳۴

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَجَابِرٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ الْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَزْنِیْ فَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ فِیْ رِوَایَۃٍ فَیَتُوْبُ فَیَغْفِرُ اللّٰہُ لَہٗ وَاِنَّ صَاحِبَ الْغِیْبَۃِ لَا یُغْفَرُ لَہٗ حَتّٰی یَغْفِرَھَا لَہٗ صَاحِبُہٗ۔ (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان صـ۴۱۵)

ترجمہ: حضرت ابوسعید و حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیبت زنا سے زیادہ سخت (گناہ) ہے تو صحابہ نے کہا کہ یارسول اللہ! غیبت زنا سے زیادہ سخت (گناہ) کس طرح ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ آدمی زنا کرتا ہے۔ پھر توبہ کر لیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما کر اس کو بخش دیتا ہے۔ لیکن غیبت کرنے والے کو خداوند تعالےٰ اس کو اُس وقت تک نہیں بخشے گا جب تک اُس کو وہ شخص نہ معاف کردے جس کی اُس نے غیبت کی ہے۔

حضرت جابرؓ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ بہت ہی مشہور صحابی ہیں۔ ان سے بکثرت احادیث مروی ہیں۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ جنگ بدر اور اس کے بعد کی اٹھارہ لڑائیوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ شریک جہاد رہے شام اور مصر بھی تشریف لے گئے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مدینہ منورہ میں ۷۴ھ کے سال ۹۴ سال کی عمر پاکر وصال فرمایا۔ سب سے آخری صحابی جن کا مدینہ میں وصال ہوا۔ وہ یہی جابر بن عبداللہ انصاری ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اکمال)

فوائد و مسائل

(۱) غیبت اُن گناہوں میں سے ہے جو سب سے زیادہ کثیر الوقوع ہے اور باوجودیکہ انتہائی سخت گناہ کبیرہ ہے۔ یہاں تک کہ زنا سے بھی بدتر ہے۔ مگر اس زمانے میں بہت ہی کم لوگ ہیں جو اس گناہ سے محفوظ ہیں۔ عوام تو عوام جُہال تو جہال بڑے بڑے علماء اور مشائخ اور عابد و زاہد لوگوں کا دامن اس گناہ سے آلودہ نظر آتا ہے۔ غضب یہ ہے کہ لوگ اس طرح غیبت کے عادی ہو گئے ہیں۔ کہ گویا غیبت ان کے نزدیک کوئی گناہ کی بات ہی نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی مجلس ایسی ہو گی جو اس گناہ کی نحوست سے خالی ہو۔

غیبت کیا ہے؟

کسی کو غائبانہ بُرا کہنا، یا پیٹھ پیچھے اس کا کوئی عیب بیان کرنا یہی (غیبت) ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ:

کیا تم لوگ جانتے ہو! کہ غیبت کیا چیز ہے؟ صحابہ نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جاننے والے ہیں حضور نے فرمایا تمہارا اپنے (دینی) بھائی کی اُن باتوں کو بیان کرنا جن کو وہ ناپسند سمجھتا ہے (یہی غیبت ہے) صحابہ نے کہا کہ یہ بتائیے کہ اگر میرے (دینی) بھائی میں واقعی وہ باتیں موجود ہوں (تو کیا ان باتوں کو کہنا بھی غیبت ہو گی؟) تو حضور نے فرمایا کہ اگر اس کے اندر وہ باتیں ہونگی جبھی تو تم اس کی غیبت کرنے والے کہلاؤ گے اور اگر اس میں وہ باتیں نہ ہوں۔ جب تو تم اس پر بہتان لگانے والے ہو جاؤ گے (جو ایک دوسرا گناہ کبیرہ ہے۔ (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان ص ۴۱۲)

اور اگر کسی شخص کا کوئی عیب اُس کو ذلیل کرنے کی نیّت سے اُس کے منہ پر کہدیا جائے تو یہ "ایذا رسانی" ہے۔ اور غیبت و بہتان کی طرح یہ "ایذا رسانی" بھی گناہ کبیرہ ہے۔ ہاں اگر اصلاح کی نیت سے کسی کا کوئی عیب اس کے سامنے نصیحت کرتے ہوئے بیان کیا جائے۔ تو یہ نہ غیبت ہے۔ نہ بہتان نہ ایذا رسانی، بلکہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے اور بہت ہی بڑے ثواب کا کام ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم!

کن کن لوگوں کی غیبت جائز ہے؟

حضرت علامہ ابوزکریا محی الدین بن شرف نووی (متوفی ۶۷۶ھ) نے مسلم شریف کی شرح میں تحریر فرمایا ہے کہ شرعی اغراض و مقاصد کے لیے کسی کی غیبت کرنا جائز اور مباح ہے اور اس کی چھ صورتیں ہیں:

اوّل: مظلوم کا حاکم کے سامنے کسی ظالم کے ظالمانہ عیوب کو بیان کرنا تاکہ اس کی دادرسی ہوسکے۔ دوم: کسی شخص کو بُرائی سے روکنے کے لیے کسی صاحبِ اقتدار کے سامنے اس کی برائیوں کو ذکر کرنا تاکہ وہ صاحب اقتدار اپنے رُعب داب سے اُس کو برائیوں سے روک دے۔ سوم: مفتی کے سامنے فتویٰ طلب کرنے کے لیے کسی کے عیوب پیش کرنا۔ چہارم: مسلمانوں کو شر و فساد اور نقصان سے بچانے کے لیے کسی عیوب کو بیان کرنا۔ مثلاً جھوٹے راویوں، جھوٹے گواہوں، بدمذہب مصنّفوں اور واعظوں کے جھوٹ اور بدمذہبی کو لوگوں سے بیان کر دینا تاکہ لوگ گمراہی کے نقصان سے محفوظ رہیں۔ یا شادی بیاہ کے بارے میں مشورہ کرنے والے سے فریقِ ثانی کے عیوب کو بتا دینا۔ یا خریدار کو نقصان سے بچانے کے لیے سامان یا سودا بیچنے والے کے عیوب سے باخبر کر دینا۔ پنجم: جو شخص علی الاعلان فسق و فجور اور بدعات و معصیات کا مرتکب ہو، اس کے عیوب کو بیان کرنا۔ ششم: کسی شخص کی شناخت اور پہچان کرانے کے لیے اس کے کسی مشہور عیب کو اس کے نام کے ساتھ ذکر کر دینا۔ جیسے محدثین کا طریقہ ہے کہ ایک ہی نام کے چند راویوں میں امتیاز اور ان کی شناخت کے لیے (اعمش (چندھا) اعرج (لنگڑا) اعمٰی (اندھا) طویل (لمبا) وغیرہ عیوب کو ان کے ناموں کے ساتھ ذکر کر دیتے ہیں۔ جس کا مقصد ہرگز ہرگز نہ توہین و تنقیص ہے۔ نہ ایذا رسانی، بلکہ صرف راویوں کی شناخت اور ان کے تعارف کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔

(نووی علی المسلم ص ۳۲۲)

⁂

پہلوان کون ہے؟

حدیث نمبر ۳۵

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔

(مسلم شریف ج ۲ ص ۳۲۶)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کو پچھاڑ دینے والا پہلوان نہیں ہے۔ پہلوان تو وہی ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کا مالک ہے۔

شرح حدیث

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام طور پر لوگ اس شخص کو بہت ہی طاقتور اور "پہلوان سمجھتے ہیں۔ جو دوسروں کو پچھاڑ دے اور لوگ اس کو نہ پچھاڑ سکیں۔ لیکن اللہ و رسول کے نزدیک بہت زیادہ طاقتور اور پہلوان وہ شخص ہے۔ کہ اگرچہ وہ کسی کو پچھاڑ نہیں سکتا۔ لیکن اس میں قوتِ حلم اور طاقت برداشت کا اتنا عظیم خزانہ ہو کہ وہ شدتِ غیظ و غضب کی حالت میں بھی اپنے نفس پر پورا پورا کنٹرول اور قابو رکھتا ہو اور غصہ کی حالت میں بھی اس سے کوئی ایسا فعل صادر نہ ہو جو عقل یا شریعت کے خلاف ہو۔ بلکہ عین غضب کی حالت میں بھی اس کے غصہ کے جوش پر اس کا ہوش غالب رہتا ہو جس کی وجہ سے وہ کوئی خلافِ شریعت حرکت نہ کر سکے اِس لیئے لوگوں کو پچھاڑنے والا نہ تو شریعت کی نگاہ میں کوئی قابلِ تعریف کارنامہ انجام دینے والا ہے۔ نہ دُنیا و آخرت میں کسی مدح و ثنا کا مستحق

اور اجروثواب کا حقدار ہے۔ مگر عین حالتِ غیظ و غضب میں جو شخص اپنے نفس پر کنٹرول اور قابو رکھے اور اس طرح اپنے نفسِ امّارہ پر غالب ہو کر اس کو دبائے رکھے کہ گناہ کا صادر ہونا تو بڑی بات ہے۔ اس کے حاشیہ خیال میں کسی گناہ کا تصور بھی نہ گزرے۔ یہ شریعت کی بارگاہ میں یقیناً دنیا و آخرت کے اندر لائقِ صد تحسین و آفرین ہے۔ اور دونوں جہان میں انعام و اکرام کے اجر و ثواب کے قابل ہے۔

جسمانی و رُوحانی طاقت

اس کا راز یہ ہے کہ کسی کو پچھاڑ دینا، یا بہت زیادہ بوجھ اٹھا لینا، یا مضبوط چیزوں کو توڑ ڈالنا یہ سب جسمانی طاقتوں کے کارنامے ہیں۔ مگر نفس پر کنٹرول اور شہوانی و غضبانی طاقتوں پر قابو پا لینا یہ "روحانی طاقت" کا کرشمہ ہے اور یہ آفتاب سے زیادہ روشن حقیقت ہے کہ روحانی طاقت والا جسمانی طاقت والے سے بہت زیادہ باکمال اور طاقتور ہوا کرتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

غصّہ

کسی خلافِ طبیعت چیز، یا بات پر نفس کا جوش مارنا، اس کیفیت کا نام "غصّہ" ہے غصّہ بذاتِ خود نہ اچھا ہے۔ نہ بُرا بلکہ غصّہ اپنے اچھے یا بُرے اثرات و ثمرات کے لحاظ سے اچھا یا بُرا ہوا کرتا ہے۔ اگر کسی انسان میں بالکل ہی غصّہ کا مادہ ہی نہ ہو تو وہ انسان بہت سے انسانی کمالات سے محروم رہ جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کا بھی اہل نہیں رہے گا۔ ظاہر ہے کہ سانپ کو مار ڈالنا، چوروں اور ڈاکوؤں سے لڑنا، کفار سے جہاد کرنا، مجرموں کو سزائیں دینا یہ سب غصّہ ہی کے کارنامے تو ہیں۔ اگر سانپ کو دیکھ کر آپ کو غصّہ نہ آئے۔ بلکہ اس پر پیار آجائے۔ تو آپ سانپ کو دیکھ کر فوراً ہی اس کو اپنے کلیجے سے چمٹا لیں گے۔ اور اس کے چکنے

چکنے منہ کا بوسہ لینا شروع کردیں گے اور وہ چند ہی منٹ میں آپ کو "عدم آباد" کا ٹکٹ دے دیگا۔ اور ذرا دیر میں نہ آپ ہندوستان رہیں گے نہ پاکستان میں بلکہ بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے آپ "قبرستان" میں پہنچ جائیں گے۔ یہ غضبی قوت اور غصہ کی طاقت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آپ سانپ کو مار کر اپنے سرمایۂ حیات کی حفاظت کا سامان کر لیتے ہیں۔ آپ کو اپنے دشمنوں پر غصہ آتا ہے۔ اسی لیے تو کیسے کیسے خوفناک ہتھیار اور ان کی گرفتاری کے لیے کیسے کیسے تیز رفتار ہوائی جہاز اور راکٹ آپ نے ایجاد کیے ہیں۔ یہ ساری جنگی ایجادات حضرتِ غصہ ہی کا طفیل تو ہیں۔ جن سے آج دنیا میں چہل پہل ہے۔ اگر موسموں کے مظالم، جاڑا، گرمی اور بدن کی عُریانی پر آپ کو غصہ نہ آتا تو یہ سینکڑوں قسم کی پوشاکیں کہاں سے تیار ہوتیں؟

بہر حال یہ عرض کرنا ہے کہ غصہ ہر انسان میں ہونا کمالِ انسانی کے لوازم میں سے ہے۔ اور غصہ فی نفسہٖ اور بذاتِ خود نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ بلکہ غصہ اچھا اور بُرا اس وجہ سے ہوا کرتا ہے کہ بے محل غصہ آیا۔ اور اس کے بُرے اثرات ظاہر ہوئے مثلاً ایک ماں سے بچھڑے ہوئے بھوکے پیاسے دودھ پیتے بچے کی گریہ و بُکا اور اس کے رونے پر آپ کو غصہ آگیا۔ اور آپ نے اُس بچے کا گلا گھونٹ کر اس کو مار ڈالا تو ظاہر ہے کہ رحمت و شفقت کے موقع پر آپ کا غصہ یقیناً بے محل اور بے موقع ہے اور اس غصہ سے جو بے رحمی کا اثر ظاہر ہوا بلاشبہ وہ دُنیا و آخرت میں قابلِ مذمت، لائقِ عذاب اور مخلوقات و خالق کائنات کی ناراضگی کا سبب ہے! اور اگر کسی خوفناک ڈاکو کو ڈاکہ ڈالتے وقت دیکھ کر آپ کو غصہ آیا اور آپ نے مارے غصہ کے دانت پیستے ہوئے بندوق چلا کر اس ڈاکو کا خاتمہ کر دیا۔ تو چونکہ آپ کا یہ غصہ بالکل بر محل اور عین موقع کے مطابق ہے کہ آپ نے ایک خطرناک ڈاکو کو قتل کر کے ہزاروں بندگانِ خدا کو سکون و اطمینان کی جنت دلا دی لہذا آپ گورنمنٹ کے انعام، پبلک کے اعزاز و اکرام اور خداوند ذوالجلال کی طرف سے اجرِ لازوال کے مستحق ہوں گے۔

ایک مثال

گویا یوں سمجھ لیجئے کہ غصّہ ایسا ہی ہے جیسے "اُسترہ" ظاہر ہے کہ اگر "اُسترہ" سے حجامت بنائی جائے۔ تو یہ بہت ہی اچھی چیز ہے اور اگر استرہ سے ناک کاٹ لی جائے تو یہ بہت ہی بُری چیز ہے۔ تو "اُسترہ" بذاتِ خود نہ اچھا ہے۔ نہ بُرا۔ بلکہ اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو یہ اچھا ہے اور اگر اس سے بُرا کام لیا جائے تو یہ بُرا ہے۔ بس غصّہ بھی بالکل ایسا ہی ہے کہ اگر غصّہ آنے پر اس غصّہ سے کوئی اچھا کام ہوا۔ تو یہ غصّہ اچھا ہے۔ اور اگر اس غصّہ سے کوئی بُرا کام ہوا تو یہ غصّہ بُرا ہے۔ اس لیے نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر غصّہ اچھا ہے، نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر غصّہ بُرا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غصّہ اچھا بھی ہے اور بُرا بھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے کہ جو شخص غصّہ کی حالت میں اپنے نفس پر کنٹرول رکھے کہ اُس کے غصّہ سے کوئی خلاف شریعت کام نہ ہونے پائے وہ "پہلوان" کہلانے کا مستحق ہے۔ اور ایسا آدمی دنیا و آخرت میں اجر و ثواب کا حقدار ہے۔ کیونکہ اس کے غصّہ سے کوئی بُرا کام نہیں ہوا۔ لہٰذا اس کا غصّہ بُرا نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم!

○

درازیٔ عمر کا نُسخہ

حدیث نمبر ۳۶

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَاَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔

(مشکوٰۃ باب البر والصلہ ص ۴۱۹)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جس شخص کو یہ اچھا لگے کہ اس کی روزی میں فراخی اور اس کی عمر میں درازی ہو۔ تو اس کو چاہیئے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرے۔

فوائد و مسائل ۱: اس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں کے ہر کام کے لیے کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوا کرتا ہے اس لیے "رزق" میں زیادتی، اور عمر کی درازی کے بھی چند اسباب ہیں۔ اُن میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور نیک سلوک کرتا رہے۔ تو اس عملِ خیر کی برکت سے انشاء اللہ تعالیٰ اس کی روزی میں فراخی و فراوانی ہو جائے گی اور اس کی عمر بھی بڑھ جائیگی۔

۲: اس حدیث کی شرح میں حضرت عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب شارع علیہ السلام نے یہ خبر دی ہے تو ایک مومن کے لیے ہے کہ اس پر ایمان رکھے اور بے چون وچرا اس پر عمل کرتا رہے اور صلہ رحمی کیوں روزی اور عمر کی زیادتی کا سبب ہے؟ اور کس طرح سبب ہے؟ اس کا علم خُدا کے سپرد کر دے اور ہرگز ہرگز اس معاملہ میں بحث و مباحثہ نہ کرے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۱۰۹)

کیوں؟ اس لیے کہ دُنیا عالمِ اسباب ہے اور خداوند کریم مسبب الاسباب ہے۔ اس نے جس چیز کو جس چیز کا سبب بنانا چاہا اُس کا سبب بنا دیا۔ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کس لیے ہُوا؟ بندہ اس کی حکمتوں سے نہ کماحقہٗ واقف ہے۔ نہ واقف ہو سکتا ہے۔ سب جانتے کہ "سنکھیا" زہرِ قاتل ہے۔ اور "تریاق" زہروں کا علاج ہے۔ مگر کوئی بتا تو دے؟ کہ "سنکھیا" کیوں؟ اور کیسے؟ اور کس لیے زہرِ قاتل ہے؟ اور "تریاق" کیوں؟ اور کیسے؟ اور کس لیے زہروں کا علاج ہے؟ ان اسباب و مُسببات کے ربط و ارتباط کو "مُسبب الاسباب" کے سوا کوئی نہیں جانتا؟

ایک سوال و جواب

ہاں! یہاں یہ ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ "باب القدر" کی حدیثوں میں مذکور ہے۔ کہ بچّہ ماں کے شکم میں رہتا ہے۔ اسی وقت ایک فرشتہ اس کی عمر، روزی اور سعادت و شقاوت خدا کے حکم سے لکھ دیتا ہے۔ جو مٹ نہیں سکتا۔ تو جس قدر عمر، اور روزی، فرشتہ نے لکھ دی ہے۔ اب اس سے زیادہ عمر اور روزی کیسے بڑھ سکتی ہے؟

تو اس سوال کا شارحینِ حدیث نے کئی طرح سے جواب دیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱: انسان کی عمر اور روزی کی مقدار تو گھٹ بڑھ نہیں سکتی۔ فرشتہ نے بحکمِ الٰہی جتنی عمر اور روزی لکھ دی ہے۔ اس کی مقدار تو اتنی ہی رہے گی۔ مگر اللہ تعالیٰ مقدار میں اتنی برکت عطا فرما دے گا۔ کہ یہ بہت زیادہ معلوم ہونے لگے گی۔

کسی چیز میں "برکت" اور "بے برکتی" کا تجربہ تو تقریباً ہر انسان کو ہوتا ہی رہتا ہے یہی بارہ گھنٹے کا دن کبھی اتنا مختصر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام ہی نہیں ہوتا اور چٹ پٹ دن ختم ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اتنا دراز ہو جاتا ہے کہ کئی کئی دنوں کا کام ایک ہی دن میں ہو جاتا ہے۔ اور دن اتنا بڑا معلوم ہوتا ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا۔ چنانچہ مصنفینِ اسلام مثلاً مولانا جلال الدین سیوطی، امام غزالی، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی وغیرہ ایسے ایسے بابرکت لوگ گزرے ہیں کہ ان کی عمروں میں اس قدر زیادہ برکت ہو گئی کہ

ان کی تصنیفات اور ان کی عمروں کا حساب لگایا جائے۔ تو ایک ایک دن میں اتنے اوراق ان بزرگوں نے تصنیف کر دیئے ہیں کہ اگر آج کوئی بڑا ہی زود نویس ان کو نقل کرنا چاہے۔ تو ایک ہفتہ میں بھی ان کو نقل نہیں کر سکتا۔ کیوں؟ اسی لیے تو کہ ان بزرگوں کے اوقات میں برکت ہوا کرتی تھی۔ تو ان کی تھوڑی سی عمریں اگرچہ مقدار میں تو تھوڑی تھیں۔ مگر برکت ہو جانے سے ان کی عمریں بہت بڑھ گئیں۔ اور لمبی لمبی عمروں والے اگرچہ مقدار میں تو ان کی عمریں بہت لمبی تھیں۔ مگر برکت نہیں ہوئی۔ تو اتنی جلد ان کی عمریں ختم ہو گئیں کہ گویا بہت ہی کم تھیں۔

تو اس حدیث میں "صلہ رحمی" کرنے والے کی روزی اور عمر میں زیادتی اور درازی کا یہی مطلب ہے کہ اس کی روزی اور عمر میں برکت ہو جاتی ہے۔

۲: بعض شارحین حدیث نے فرمایا کہ رزق اور عمر میں زیادتی کا یہ مطلب ہے کہ اس کی روزی اور عمر ضائع نہیں ہوتی۔ بلکہ فرشتہ نے جو روزی اور عمر لکھ دی ہے نہ اس روزی کا ایک دانہ ضائع ہوتا ہے۔ نہ اُس عمر کا ایک لمحہ برباد ہوتا ہے اور دُوسرے لوگوں کی روزی اور عمر کا بہت سا حصہ ضائع ہو جایا کرتا ہے۔ تو جس کی روزی اور عمر کا کچھ حصہ بیماریوں اور دوسرے عوارض کی وجہ سے ضائع اور بیکار ہو گیا۔ گویا اس کی روزی اور عمر گھٹ گئی اور جس کی روزی اور عمر بالکل ہی ضائع اور برباد نہیں ہوئی۔ گویا اس کی روزی اور عمر بڑھ گئی۔

۳: بعض علماء نے فرمایا کہ روزی اور عمر بڑھنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیک اولاد عطاء فرماتا ہے۔ جس کی بدولت مرنے کے بعد بھی اس کا ذکر جمیل دنیا میں باقی رہتا ہے یا اس سے کوئی ایسا نیک کام انجام پاجاتا ہے کہ ہمیشہ اس کی نیک نامی کا ڈنکا بجتا رہتا ہے، تو گویا اس کی روزی اور عمر بڑھ گئی۔ اور جس کے مرتے ہی اس کی نیک نامی کا نام و نشان بالکل مٹ جاتا ہے۔ گویا اس کی روزی اور عمر گھٹ گئی۔ (حواشی مشکوٰۃ ص۴۱۹)

واللہ تعالیٰ اعلم!

قبر میں ثواب

حدیث نمبر ۳۷

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلٰثَةٍ اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ اَوْ عِلْمٍ یُّنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْلَهٗ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

(مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۳۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس سے اس کے عمل کا ثواب کٹ جاتا ہے۔ مگر تین عمل سے (کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے)۔ ۱۔ صدقۂ جاریہ کا ثواب۔ ۲۔ یا اس علم کا ثواب جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ ۳۔ یا نیک اولاد جو اس کے لیے دُعا کرتی رہے)

شرحِ حدیث

انسان جب تک زندہ رہتا ہے۔ قسم قسم کے اعمال صالحہ کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے نیک اعمال کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ مگر جب انسان مرجاتا ہے۔ تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے اجر و ثواب کا سلسلہ بھی کٹ جاتا ہے۔ لیکن تین آدمی ایسے خوش نصیب ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان کے اعمال کے اجر و ثواب کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور برابر ان کی قبروں میں ثواب پہنچتا رہتا ہے۔

ان میں سے پہلا شخص تو وہ ہے جو اپنی زندگی میں کوئی "صدقہ جاریہ" کر کے

مرا ہو۔ تو اگرچہ وہ مر کر قبر میں سو رہا ہے۔ اور کوئی عمل نہیں کر رہا ہے۔ مگر اُس کے نامۂ اعمال میں اُس کے "صدقۂ جاریہ" کا ثواب برابر درج ہوتا رہتا ہے۔

"صدقۂ جاریہ" کیا ہے؟ مثلاً مسجد بنوانا۔ مدرسہ بنوانا۔ کنواں بنوانا۔ مسافر خانہ بنوانا۔ یا کارِ خیر کے لیے کوئی جائداد وقف کر دینا۔ جب تک یہ چیزیں باقی رہیں گی برابر ان کے ثواب کا سلسلہ قائم رہے گا۔ اور ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کا ثواب ملتا رہے گا۔ اس کی بنوائی ہوئی مسجد میں جو نمازیں پڑھی جائیں گی اور جتنی نمازیں پڑھی جائیں گی جس طرح نماز پڑھنے والوں کو ثواب ملے گا۔ اسی طرح مسجد بنوانے والے کو بھی اس کا ثواب ملتا رہے گا۔ اس کے بنوائے ہوئے مدرسہ میں جو لوگ پڑھیں۔ پڑھائیں گے۔ اس کے بنوائے ہوئے کنویں سے جتنے پیاسے سیراب ہوں گے۔ جتنے لوگ وضو کریں گے ان سب کا ثواب مدرسہ اور کنواں بنوانے والے کو ملے گا۔ اسی طرح جائداد موقوفہ سے جتنے کارِ خیر ہوں گے۔ سب کا ثواب واقف کو ملتا رہے گا۔ اور وقف کرنے والے کی قبر میں اجر و ثواب پہنچتا رہے گا۔

دوسرا شخص وہ ہے جو کوئی ایسا علم چھوڑ کر مرا ہو۔ جس سے اُمتِ رسول کو نفع حاصل ہوتا ہو۔ مثلاً کوئی مفید کتاب لکھ کر مرا ہو۔ یا کچھ شاگردوں کو علم پڑھا کر مر گیا ہو یا علمِ دین کی کتابیں خرید کر وقف کر گیا ہو۔ تو جس طرح علمِ دین پڑھنے پڑھانے والوں کو ثواب ملے گا۔ اس طرح اُس شخص کی قبر میں بھی اجر و ثواب ملتا رہے گا۔

تیسرا شخص وہ ہے جس نے اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت دے کر نیک اور صالح بنا دیا ہو تو اس کے مرنے کے بعد اس کی سب اولاد جو اس کے لیے ایصالِ ثواب اور دُعائے مغفرت کرتی رہے گی۔ اس کا اجر و ثواب اس کو ہمیشہ ملتا رہے گا۔

خداوند کریم ہر مُسلمان کو دنیا میں ان تینوں اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین!

بیٹیاں

حدیث نمبر ۳۸

اَنَّ عَائِشَۃَ زَوْجَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَتْ جَاءَتْنِیْ اِمْرَأَۃٌ وَّمَعَھَا ابْنَتَانِ لَھَا فَسَئَلَتْنِیْ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِیْ شَیْئًا غَیْرَ تَمْرَۃٍ وَّاحِدَۃٍ فَاَعْطَیْتُھَا اِیَّاھَا فَاَخَذَتْھَا، فَقَسَمَتْھَا بَیْنَ ابْنَتَیْھَا وَلَمْ تَاْکُلْ مِنْھَا شَیْئًا ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ وَابْنَتَاھَا فَدَخَلَ عَلَیَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَدَّثْتُہٗ حَدِیْثَھَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتُلِیَ مِنَ الْبَنَاتِ بِشَیْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَیْھِنَّ کُنَّ لَہٗ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ

(مسلم ج ۲ ص ۳۳۰ باب الاحسان الی البنات)

ترجمہ: حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مبارکہ حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میرے پاس ایک عورت اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ آئی اور مجھ سے کچھ مانگا، تو میرے پاس اُس نے ایک کھجور کے سوا کچھ نہیں پایا میں نے وہی کھجور اس کو دیدی۔ تو اُس نے اس کھجور کو اپنی دو لڑکیوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور خود اس میں سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ پھر وہ اُٹھی اور اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ پھر جب میرے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ تو میں نے حضور سے اس عورت کی بات بیان کر دی تو حضور نے فرمایا جو شخص بیٹیوں کے ساتھ مبتلا کیا گیا اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو یہ بیٹیاں اس کے لیے جہنم سے پردہ بن جائیں گی۔

فوائد و مسائل

۱: اس حدیث کی بعض روایتوں میں یوں بھی آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَوْجَبَ لَھَا بِھَا الْجَنَّۃَ اَوْ اَعْتَقَھَا بِھَا مِنَ النَّارِ (مسلم جلد ۲ ص ۳۳۰) یعنی اللہ تعالیٰ نے اس عورت کے لئے جنت واجب فرما دی، یا حضور نے یہ فرمایا کہ اس عورت کو اللہ تعالیٰ نے جہنم سے آزاد فرما دیا۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یوں آیا ہے کہ جو مسلمان دو بیٹیوں کو ان کے بالغ ہونے تک پرورش کرے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر فرمایا کہ میں اور وہ دونوں اس طرح قیامت کے دن ساتھ رہیں گے۔

۲: اس حدیث میں ہے کہ جب بھیک مانگنے والی عورت اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی۔ تو اس وقت حضرت بی بی عائشہ صدیقہ کے پاس ایک ہی کھجور تھی۔ وہی ایک کھجور انہوں نے سوال کرنے والی عورت کو دیدی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقہ کے لیے مال کثیر ہی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ کم سے کم چیز کو بھی صدقہ کرنے میں شرم و حیا نہیں کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کو دیکھنے والا ہے وہ تھوڑے صدقہ پر بھی زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے۔ بشرطیکہ صدقہ دینے والے میں اخلاص نیت ہو۔

۳: اس حدیث میں بیٹی والے باپ کو حضور نے "مَنِ ابْتُلِیَ مِنَ الْبَنَاتِ بِشَیْءٍ" فرمایا۔ یعنی خدا نے اس کو بیٹیاں دے کر امتحان اور آزمائش میں ڈالا۔ سوال یہ ہے کہ خدا نے بیٹیوں کو باپ کے لیے ذریعہ ابتلاء و آزمائش کیوں فرمایا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ چونکہ عموماً بیٹیوں سے رغبت نہیں رکھتے۔ بلکہ بعض تو نفرت کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں انسانی عادت کا بیان فرماتے ہوئے حضرت حق جل مجدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ ۝ یعنی جب کسی کو بیٹی ملنے کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے۔ اور وہ گھٹنے لگتا ہے۔

غرض بیٹیاں عام طور پر ناپسندیدہ ہوا کرتی ہیں اور جب کسی کو کوئی ایسی چیز ملے جو اس کو پسند نہ ہو تو در حقیقت وہ چیز اس کے لیے ذریعہ ابتلاء اور آزمائش ہی کا سامان ہو گی

اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹیوں کو باپ کے لیے ذریعہ ابتلاء اور آزمائش اور امتحان کا سامان بتایا۔

۴: اس حدیث میں ان ماؤں اور باپوں کے لیے بہت بڑی "بشارت عظمیٰ" اور عظیم الشان خوشخبری ہے جو چند بیٹیوں کے ماں باپ ہیں اور محبّت و شفقت کے ساتھ ان بیٹیوں کو خدا کی نعمت سمجھ کر پالتے اور پرورش کرتے ہیں اور بالغ ہو جانے پر پورے اعزاز کے ساتھ ان کی شادی بیاہ کر کے ان کو اپنے گھر سے رخصت کرتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان ماؤں اور باپوں کو حضور صلی اللہ وسلم قیامت کے دن اپنے ساتھ رکھیں گے۔ اور یہ ایمان ہے کہ قیامت کے دن جس خوش نصیب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دامنِ رحمت مل گیا۔ اس کا بیڑا پار ہو گیا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو جہنم سے آزاد فرما دے گا اور ضرور اس کو جنّت عطاء فرما دے گا۔

• حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر اس پر ایمان کے ساتھ پورے پورے طور پر عمل کرنا۔ ہر مسلمان کے لیے اس کی سعادت دارین کی گارنٹی ہے اللہ تعالیٰ ہر بیٹی والے ماں باپ کو اس آزمائش اور امتحان میں کامیاب فرمائے۔ اور اپنی امداد و نصرت سے ایسے والدین کی خاص طور پر مدد فرمائے آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ اجمعین۔

○

خیر خواہی

حدیث نمبر ۳۹

عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ قَالَ سَمِعْتُ جَرِيْرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ قَامَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَيْكُمْ بِاتِّقَاءِ اللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَالْوَقَارِ وَالسَّكِيْنَةِ حَتّٰى يَاْتِيَكُمْ اَمِيْرٌ فَاِنَّمَا يَاْتِيْكُمُ الْاٰنَ ثُمَّ قَالَ اِسْتَعْفُوْا لِاَمِيْرِكُمْ فَاِنَّهٗ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْتُ اُبَايِعُكَ عَلَى الْاِسْلَامِ فَشَرَطَ عَلَيَّ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ فَبَايَعْتُهٗ عَلٰى هٰذَا وَرَبِّ هٰذَا الْمَسْجِدِ اِنِّيْ لَنَاصِحٌ لَّكُمْ ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ (بخاری جلد ۱ صہ ۱۴)

ترجمہ: زیاد بن علاقہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت جریر بن عبد اللہ سے سُنا۔ جس دن مغیرہ بن شعبہ (حاکم کوفہ) کا وصال ہوا۔ تو وہ (خطبہ کے لیے) کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثناء کی۔ اور فرمایا کہ تم لوگوں پر لازم ہے کہ اللہ سے ڈرو۔ جو وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ اور وقار و سکون کو لازم پکڑلو۔ یہاں تک کہ تمہارا دوسرا حاکم آجائے۔ اور وہ اب آتا ہی ہے پھر کہا کہ اپنے سابق حاکم کے لیے مغفرت کی دُعا کرو۔ اس لیے کہ وہ بھی عفو و درگزر کو پسند کرتے تھے۔ پھر فرمایا کہ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (بیعت کے لیے) حاضر ہیں ہوا میں نے عرض کیا کہ میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ تو آپ نے اسلام کے ساتھ یہ شرط لگا کر کہ ہر مسلمان کی "خیر خواہی" کرنا مجھے بیعت فرمایا۔ تو میں نے اس

شرط پر آپ سے بیعت کرلی۔ مجھے اس مسجد کے رب کی قسم ہے کہ (اے کوفہ والو) میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ پھر آپ نے مغفرت کی دعا مانگی اور منبر پر سے اتر گئے۔

شرح حدیث حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن کوفہ کی جامع مسجد میں خطبہ پڑھتے ہوئے اس حدیث کو بیان فرمایا۔ چونکہ گورنر کے انتقال کے بعد عموماً عوام میں انتشار پھیل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ خصوصاً کوفہ جہاں کے لوگ انتشار اور ہیجان پھیلانے کے عادی تھے۔ اس خطرہ کا بہت زیادہ امکان تھا۔ اسی لیے حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی نے عوام کو پُرسکون رہنے کی تلقین فرماتے کے لیے یہ خطبہ دیا اور اس خطبہ میں خدا کی حمد و ثنا کرنے کے بعد آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اے مسلمانو! تم لوگ اپنے ہر عمل اور اپنی ہر حرکت و سکون میں ہمیشہ خوفِ الٰہی کو اپنے پیش نظر رکھو۔ اور خبردار! کوئی ایسی حرکت نہ کرو، جس سے اللہ تعالیٰ تم پر ناراض ہو جائے۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ نہایت ہی سکون واطمینان کے ساتھ رہو۔ بہت جلد مرکزی حکومت کی طرف سے نیا گورنر آنے والا ہے۔ جو آکر نظامِ حکومت سنبھال لے گا۔ پھر آپ نے عوام سے یہ فرمائش کی۔ "کہ تم لوگ اپنے سابق گورنر (حضرت مغیرہ بن شعبہ) کے لیے دعائیں مانگو کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت کے انعام واکرام سے نوازے۔ کیونکہ تمہارا سابق گورنر بہت زیادہ درگزر کرنیوالا، اور خطاکاروں کی خطائیں معاف کرنے والا تھا۔ پھر اس کے بعد آپ نے یہ حدیث سنائی کہ میں جب بارگاہِ رسالت میں اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا اور میں نے حضور کی بارگاہ میں یہ درخواست پیش کی کہ یا رسول اللہ! میں اسلام پر قائم رہنے کی بیعت کرتا ہوں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط پر مجھ کو بیعت فرمایا کہ اسلام پر قائم رہنے کے ساتھ ساتھ تم عمر بھر ہر مسلمان کی خیر خواہی کرتے رہنا۔ چنانچہ میں نے اس شرط کو قبول کرتے ہوئے بیعت کی۔ لہٰذا میں اس مسجد کے رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جس طرح اپنی بیعت کے مطابق آج تک ہر مسلمان کی خیر خواہی کرتا رہا ہوں۔ تمہارا بھی خیر خواہ ہوں۔ اور تمہاری خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہوئے میں تم لوگوں کو پُرسکون رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے مغفرت کی دعا فرمائی۔ اور منبر سے اتر گئے۔

حضرت مُغیرہ بن شعبہ

بہت ہی شاندار اور زیرک و ہوشیار صحابی ہیں۔ مُلکی انتظام اور نظم و نسق قائم کرنے کا ان کو بڑا ملکہ اور بہترین مہارت تھی۔ انتہائی طاقتور، عالی دماغ اور بہادر تھے۔ ان کا تعلق قبیلۂ ثقیف سے تھا۔ اس لیے ثقفی کہلاتے ہیں۔ جنگ خندق کے سال ۵ھ میں اسلام قبول کیا اور ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں ان کو کوفہ کا گورنر بنا دیا تھا۔ چنانچہ کوفہ کی گورنری کے دوران ہی ۵۰ھ میں مرض طاعون میں مبتلا ہو کر ستر سال کی عمر میں وصال فرمایا۔ اور ان کے بعد حضرت جریر بن عبداللہ بجلی ہی کو مرکزی گورنمنٹ نے کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ (اکمال وغیرہ)

فوائد و مسائل

۱: اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الشروط میں بھی ذکر کیا ہے اور امام مسلم نے کتاب الایمان میں اور امام نسائی نے بیعت کے باب میں تحریر کیا ہے۔

۲: "نصیحة" عربی میں بہت ہی جامع لفظ ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ "خیر خواہی کرنا" "دوسروں کا بھلا چاہنا" ہے۔

"دوسروں کا بھلا چاہنا" ہے اور ہر مسلمان کے ساتھ "خیر خواہی" کرنا۔ اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ "ہر مسلمان کی خیر خواہی" یہ ایک ایسا عملِ خیر ہے کہ اگر ہر مسلمان اس تعلیم نبوت کو حرز جان بنا کر اس پر عمل شروع کر دے۔ تو ایک دم مسلمانوں کے بگڑے ہوئے معاشرہ کی کایا پلٹ جائے۔ اور "مسلم معاشرہ" آرام و راحت اور سکون و اطمینان کا ایک ایسا گہوارہ بن جائے کہ دنیا ہی میں بہشت کے سکون و اطمینان کا جلوہ نظر آنے لگے۔

ظاہر ہے کہ جب ہر مسلمان اپنی زندگی کا یہ نصب العین بنالے گا۔ کہ میں ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا۔ تو ہر قسم کے مکر و فریب، نقصان و ضرر، ظلم و ستم، بغض و حسد، خلاف و

شقاق، عناد و نفاق، بدخواہی و ایذا رسانی تمام قبیح خصلتوں کا مسلمانوں کے گھروں سے جنازہ نکل جائے گا۔ اور ہر مسلمان ہر ایک مسلمان کے لیے صلاح و فلاح اور نفع رسانی و بھلائی کے سوا نہ کچھ کر سکے گا۔ نہ کچھ سوچ سکے گا۔ نہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ساتھ خیانت کرے گا۔ نہ چغلی۔ غیبت اور افترا پردازی کا مرتکب ہوگا۔ نہ ظلم کے کسی پہلو کو بھی اپنے گوشۂ خیال میں آنے دے گا۔ نہ کسی کے بنتے ہوئے کام میں روڑا اٹکائے گا۔ بلکہ وہ سب کا بھلا چاہے گا اور سب کے ساتھ بھلائی کرے گا۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا نہ کہ لوگ بھی اس کی خیر خواہی اور بھلائی کریں گے۔ اور وہ بھی ہر نقصان سے محفوظ رہے گا اور ہمیشہ اس کا بھلا ہوتا رہے گا۔

۳: علامہ کرمانی نے " اَلنُّصْحُ لِكُلِّ مُسْلِمٍ " کی شرح میں تحریر فرمایا کہ " وَاَمَّا النَّصِيْحَةُ لِلْعَامَّةِ فَاِرْشَادُهُمْ اِلٰى مَصَالِحِهِمْ وَكَفُّ الْاَذٰى عَنْهُمْ " یعنی عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا یہ مطلب ہے کہ ہر مسلمان کو اس کی مصلحتوں اور بھلائیوں کی طرف راہنمائی کرتے رہنا اور ہر مسلمان سے ہر قسم کی تکالیف کو دور کرتے رہنا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کی ہر قسم کی نفع رسانی کرنا اور ہر مسلمان کو ہر قسم کی ضرر رسانی سے بچانا۔

واللہ تعالیٰ اعلم!

بول میں ہلکے، تول میں بھاری

حدیث نمبر ۸۴

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَلِمَتَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ ٥

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دو کلمے رحمٰن کو بہت زیادہ محبوب ہیں۔ یہ زبان پر بہت ہی ہلکے اور میزان (عمل) میں بہت ہی بھاری ہیں (وہ دو کلمے یہ ہیں (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ ٥

فوائد و مسائل ۱: یہ صحیح بخاری شریف کی سب سے آخری حدیث ہے۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب کو "انما الاعمال بالنیات" کی حدیث سے شروع فرمایا۔ اور اس حدیث پر اپنی کتاب کو ختم فرمایا۔ اس لیے کہ حدیثِ نیت کا تعلق دنیا سے ہے۔ کیونکہ دنیا اعمال کا گھر ہے اور اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔ اور اس حدیث کا تعلق آخرت سے ہے۔ کیونکہ میزانِ عمل کی تول آخرت میں ہوگی۔ اس میں ایک لطیفہ اشارہ ہوگیا کہ میزانِ عمل میں اسی کے اعمال کا وزن بھاری ہوگا جس کی نیت اچھی ہوگی۔

۲: ان دونوں جملوں میں خدا کی تسبیح اور حمد کا ذکر ہے۔ علامہ کرمانی نے بیان فرمایا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں۔ ایک "صفاتِ وجودیہ" جیسے حیات، علم، قدرت، کلام، سمع، بصر، وغیرہ ان کو "صفاتُ الاکرام" کہتے ہیں۔ دوسری "صفات عدمیہ" جیسے لاشریک لہٗ، لامثل لہٗ، لافنالہٗ وغیرہ ان کو "صفات الجلال" کہتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی ذاتِ اقدس کو ذوالجلال والاکرام فرمایا ہے۔

تو ان کلمات میں "تسبیح" سے خدا کی صفات الجلال کی طرف اشارہ ہے اور "حمد" سے صفات الاکرام کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو تمام عیوب و نقائص سے پاک جانتا اور مانتا ہوں اور اس کی تمام صفاتِ کمالیہ کے ساتھ اس کی حمد و ثناء کرتا ہوں۔ (حواشی بخاری ص ۱۱۲۹)

۳: اس حدیث میں "کلمتان" سے مراد "کلامان" ہے کیونکہ لغت میں کلام کو بھی کلمہ کہتے ہیں۔ لہٰذا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ یہ دو کلام یعنی دو جملے ایسے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ محبوب اور پسند ہیں۔ زبان پر بہت ہلکے پھلکے ہیں۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ مگر قیامت کے دن میزان عمل میں جب اعمال تولے جائیں گے تو ان جملوں کے اجر و ثواب کا وزن بہت بھاری ہوگا۔ یعنی عمل بہت تھوڑا سا ہے مگر اس کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہے۔

۴: بخاری شریف کی "کتاب الدعوات" میں ہے کہ ان دونوں جملوں میں سے ایک جملہ کے ثواب کا ذکر فرماتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ فِیْ یَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ حُطَّتْ خَطَایَاهُ وَاِنْ کَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ۔ یعنی جو شخص دن بھر میں ایک سو مرتبہ (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ) پڑھ لے تو اس کے تمام گناہ (صغیرہ) معاف کر دیئے جائیں گے۔ اگرچہ اس کے گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔

۵: کسی عمل پر اجر و ثواب عطا فرمانا یہ خدا کریم کے فضل و کرم پر موقوف ہے وہ مالک بے نیاز چاہتا ہے تو تھوڑے سے عمل پر اجر عظیم عطا فرما دیتا ہے اور اس کے فضل و کرم

کی کوئی حد نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ارشاد ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

یعنی اللہ تعالیٰ اپنا فضل جس کو چاہتا ہے۔ عطا فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔

لہٰذا اگر کسی چھوٹے عمل پر اپنے فضل عظیم سے وہ ثواب عظیم عطا فرمائے۔ تو یہ اس کے فضل وکرم کا جلوہ ہے۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

تَمَّتْ بِالْخَيْرِ

مختصر تذکرۂ محدثینؒ

(صحاح ستّہ کے مصنفین اور دوسرے چند محدّثین کا تعارف)

حضرت امام بخاری

آپ کی کنیّت ابو عبداللہ اور نام و نسب محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بُردِزبہ بخاری جعفی ہے۔ آپ کے پردادا "مغیرہ" حاکم بخارا "یمان جعفی" کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور چونکہ اُس زمانے کا دستور تھا کہ جو شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا تھا اُس کی اسی قبیلہ کی طرف نسبت کیا کرتے تھے۔ اس لیے امام بخاری کو بھی لوگ "جعفی" کہنے لگے۔

آپ ۱۳ ارشوال ۱۹۴ھ کو جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ پیدا ہوئے اور باسٹھ برس کی عمر میں شب شنبہ عید الفطر کی رات میں عشاء کی نماز کے وقت ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔ اور "خرتنگ" نامی گاؤں میں جو سمرقند سے دس میل کے فاصلہ پر ہے مدفون ہوئے۔

آپ بچپن ہی میں نابینا ہو گئے تھے مگر آپ کی والدہ کی دعاؤں سے خداوند تعالیٰ نے پھر آپ کو بصارت عطا فرما دی۔ بچپن ہی سے حدیثوں کو یاد کرنے کا شوق تھا اور حافظہ بیحد قوی تھا۔ دس برس کی عمر سے حدیثیں یاد کرنے لگے۔ یہاں تک کہ سولہ برس کی عمر میں حضرت عبداللہ بن مبارک (شاگرد ابو حنیفہ) کی تمام کتابوں کو یاد کر ڈالا۔ پھر اپنی والدہ اور اپنے بھائی احمد بن اسمٰعیل کے ہمراہ حج کے لیے گئے۔ حج کے بعد والدہ اور بھائی تو وطن واپس چلے آئے۔ مگر آپ حجاز میں حدیث پڑھنے کے لیے ٹھہر گئے۔ پھر تمام علمی درسگاہوں کا سفر کر کے ایک ہزار اسّی شیوخ کی خدمتوں میں حاضری دے کر چھ لاکھ حدیثوں کو زبانی یاد کر لیا۔ آپ نے علم حدیث کی طلب میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، بغداد، مصر، واسط، الجزائر، شام، بلخ، بخارا، مرو، ہرات، نیشاپور وغیرہ علمی مرکزوں کا بار بار سفر فرمایا۔

آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ مگر آپ کی "صحیح بخاری شریف" بہت شاندار اور بلند پایہ حدیث کی کتاب ہے جو صحاح ستّہ میں سب سے بڑی اور عظیم الشان کتاب

ہے جس کو چھ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے سولہ برس کی محنت شاقہ اٹھا کر آپ نے تصنیف فرمایا۔ اس کتاب میں کل حدیثیں اگر مکررات و معلقات و متابعات کو شامل کر کے شمار کی جائیں تو نو ہزار بیاسی حدیثیں ہیں۔ اور اگر مکررات کو حذف کر کے گنتی کی جائے تو صحیح بخاری شریف کی کل حدیثوں کی تعداد صرف دو ہزار سات سو اکسٹھ رہ جاتی ہے۔
آپ کے شاگردوں کی تعداد نوّے ہزار ہے جنہوں نے صحیح بخاری شریف کو بلاواسطہ خود امام بخاری سے پڑھا۔ اور آپ کے سب سے آخری شاگرد محمد بن یوسف فربری ہیں۔ جنہوں نے ۳۲۰ھ میں وفات پائی۔

امیر بخارا خالد بن احمد ذُہلی نے اس بنا پر کہ آپ اُس کے لڑکوں کو اس کے دربار میں حدیث پڑھانے کے لیے تشریف نہیں لے گئے۔ آپ کو بخارا سے شہر بدر کر دیا۔ آپ بخارا سے نیشا پور چلے گئے۔ وہاں کے متکبّر حاکم سے بھی آپ کی نہیں بنی۔ تو مجبوراً آپ ایک چھوٹے سے گاؤں خرتنگ میں بیٹھ کر حدیثوں کا درس دینے لگے۔ یہاں تک کہ اسی گاؤں میں آپ کی وفات ہو گئی۔ دفن کے بعد آپ کی قبر کی مٹی سے مشک کی خوشبو آنے لگی۔ چنانچہ مدتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ لوگ دور دور سے آکر آپ کی قبر کی مٹی کو خوشبو کی وجہ سے اٹھا لے جاتے تھے۔

امام بخاری نہایت زاہد و پرہیزگار اور صاحبِ تقویٰ و عبادت گذار تھے۔ عمر بھر کسی کی غیبت نہیں کی۔ اُمراء و سلاطین کے درباروں میں کبھی نہیں گئے۔ درس حدیث کے بعد فاضل اوقات میں کثرتِ نوافل اور تلاوتِ قرآن مجید کا شغل رکھتے تھے۔۔ رحمہ اللہ تعالیٰ
(بستان المحدثین مقدمہ بخاری وغیرہ)

امام مُسلم آپ کی کنیت ابوالحسین اور نام و نسب مُسلم بن حجّاج بن مُسلم ہے۔ اور لقب عساکر الدین ہے۔ بنی قشیر قبیلہ کی طرف نسبت ہونے کی وجہ سے "قشیری" کہلاتے ہیں۔ نیشاپور کے رہنے والے ہیں۔ جو خراسان کا بہت ہی خوبصورت اور مردم خیز شہر ہے۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور بعضوں نے آپ کا سنہ ولادت ۲۰۴ھ اور بعض نے ۲۰۶ھ تحریر کیا ہے۔ مگر ان کی وفات پر تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ ۲۴ رجب ۲۶۱ھ میں آپ کا وصال ہُوا۔

آپ کا شمار حدیث کے جلیل القدر اماموں میں ہے۔ آپ نے حدیث کی طلب میں عراق، حجاز، شام، مصر وغیرہ کے بہت سے علمی مراکز کا سفر کیا۔

آپ کے استادوں میں امام احمد بن حنبل یحیٰی بن یحیٰی نیشاپوری، قتیبہ بن سعید اسحٰق بن راہویہ، عبداللہ بن مسلمہ قعنبی وغیرہ سینکڑوں ائمہ حدیث ہیں اور امام ترمذی وابوبکر بن خزیمہ جیسے حدیث کے پہاڑوں نے آپ کی شاگردی اختیار کی۔ تین لاکھ حدیثیں آپ کو زبانی یاد تھیں۔

آپ کی بہت سی تصانیف میں سے آپ کی کتاب "صحیح مسلم شریف" جو صحاح ستہ میں داخل ہے۔ اس میں فن حدیث کے عجائبات اور خاص کر لطائف اسناد، اور متونِ حدیث کے حُسنِ سیاق کی ایسی بے مثال مثالیں ہیں جو بلاشبہ نوادرات کا درجہ رکھتی ہیں۔

آپ کی وفات کا سبب بڑا ہی عجیب وغریب ہے۔ آپ ایک حدیث کی تلاش میں کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔ کھجوروں کا ایک ٹوکرا آپ کے قریب رکھا ہوا تھا۔ مطالعہ کی حالت میں ایک ایک کھجور اس میں سے کھاتے رہے اور مطالعہ میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ حدیث ملنے تک تمام کھجوریں تناول فرما گئے اور آپ کو کچھ خبر نہیں ہوئی اس کے بعد آپ کو درد شکم ہوا۔ اور یہی آپ کی وفات کا سبب بنا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(بستان المحدثین، اکمال وغیرہ)

امام ترمذی آپ کی کنیت ابوعیسیٰ اور نام ونسب محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سُلمی بُوغی ہے "بُوغ" ایک گاؤں کا نام ہے جو شہر "ترمذ" سے چھ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اس گاؤں کی طرف نسبت ہونے سے آپ "بُوغی" بھی کہلاتے ہیں۔ آپ اسی گاؤں میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۷ رجب شب دوشنبہ ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ اور خاص "ترمذ" شہر میں مدفون ہوئے۔

آپ امام بخاری کے سب سے مشہور شاگرد و جانشین شمار کیے جاتے ہیں۔ اور آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ خود امام بخاری نے بعض حدیثوں میں ان کی شاگردی اختیار فرمائی ہے۔ علم حدیث کے لیے ہزاروں میل کا سفر کیا۔ آپ کی تصنیفات میں سے

"جامع ترمذی شریف" بیحد مشہور و مقبول کتاب ہے جو صحاح ستہ میں داخل ہے اور اس قدر مفید کتاب ہے کہ مجموعی حیثیت سے اس کو صحاح ستہ کی تمام کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ آپ اپنے دور کے بے مثال عابد و زاہد تھے۔ شب بیداری اور خوف الٰہی سے گریہ و زاری کے سبب سے پہلے آنکھوں میں آشوب چشم ہوا۔ پھر بینائی جاتی رہی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ (بستان المحدثین و اکمال وغیرہ)

امام ابوداؤد آپ کا نام و نسب سلیمان بن اشعث بن شداد بن عمرو ہے، ۲۰۲ھ میں بمقام بصرہ آپ کی ولادت ہوئی۔ اور ۱۴ر شوال ۲۷۵ھ کو بصرہ ہی میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کا وطن بصرہ تھا۔ مگر بارہا آپ نے بغداد میں اقامت فرمائی اور مدتوں بغداد میں رہے۔ آپ نے علم حدیث کی طلب میں حجاز، عراق، خراسان، جزیرہ وغیرہ کا سفر فرمایا۔ اور ہزاروں محدثین سے حدیث کی سماعت و روایت فرمائی۔ عمر بھر حدیث کا درس دیتے رہے۔ اسی لیے آپ کے شاگردوں کی تعداد اسقدر زیادہ ہے کہ ان کا شمار انتہائی دشوار ہے!

"کتاب سُنن ابوداؤد" آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ پانچ لاکھ حدیثوں میں سے چُن کر چار ہزار آٹھ سو احادیث آپ نے اپنی اس کتاب میں جمع فرمائی ہیں۔ کتاب سُنن ابوداؤد صحاح ستہ میں داخل ہے۔ بغداد کے اولیاء کرام آپ کا بے حد احترام کرتے تھے بغداد کے ایک صاحب کرامت مشہور ولی حضرت سہل بن عبداللہ تستری ایک دن امام ابوداؤد کی ملاقات کے لیے آئے اور فرمایا کہ اے ابوداؤد! آپ اپنی زبان باہر نکالیے۔ میں آپ کی زبان کا بوسہ لوں گا۔ کیوں کہ آپ اس زبان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر امام ابوداؤد نے اپنی زبان منہ سے باہر نکالی۔ اور سہل عبداللہ تستری نے نہایت گرمجوشی اور پیار کے ساتھ امام ابوداؤد کی زبان چوم لی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (بستان المحدثین و تاریخ ابن ماجہ وغیرہ)

امام نسائی امام قاضی ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی نسائی بہت ہی جلیل القدر اور بلند پایہ محدث ہیں۔ آپ کی کتاب "سُنن نسائی" صحاح ستہ میں

داخل ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ آپ کے اساتذہ و تلامذہ اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ درس حدیث و فتاویٰ و تصنیف کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے عبادت گزار تھے۔ تمام عمر صوم داؤدی کے پابند رہے۔ یعنی ایک دن کا ناغہ دے کر ہمیشہ روزہ رکھتے رہے۔ امراء و سلاطین کے درباروں سے سخت متنفر اور ان لوگوں کی ملاقاتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے رہے ۲۱۴ھ میں آپ خراسان کے شہر "نسا" میں پیدا ہوئے۔ اور مصر کے حاسد علماء کے ہاتھوں سے بلا قصور مار کھا کر اور زخمی ہو کر آپ مکہ مکرمہ چلے آئے۔ اور ۱۳ صفر ۳۰۳ھ میں آپ کو شہادت نصیب ہوئی اور صفا مروہ کے درمیان مدفون ہوئے۔ مگر یونس کا قول ہے کہ آپ کی وفات ۱۳ صفر ۳۰۳ھ کو فلسطین میں ہوئی۔ پھر وہاں سے آپ کی لاش مبارک مکہ مکرمہ پہنچائی گئی۔ (واللہ تعالیٰ اعلم) رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (بستان المحدثین ، اکمال ، تہذیب التہذیب)

امام ابن ماجہ

ابو عبداللہ کنیت، محمد بن یزید نام، اور ربعی قزوینی نسبت ہے مگر عام طور پر "ابن ماجہ" کے عرف کے ساتھ مشہور ہیں اور صحیح قول یہی ہے کہ "ماجہ" آپ کی والدہ کا نام ہے۔ صحاح ستہ میں "سنن ابن ماجہ" آپ ہی کی تصنیف ہے۔ آپ "قزوین" کے رہنے والے ہیں۔ جو ایران کے صوبہ آذربائیجان کا ایک مشہور شہر ہے آپ نے حدیث کی طلب میں حجاز، عراق، شام، خراسان کا علمی سفر فرمایا اور خاص کر بصرہ، کوفہ اور بغداد و حرمین شریفین و دمشق کے شہروں میں مقیم رہ کر تقریباً تین سو دس شیوخ سے احادیث کی روایت فرمائی۔ اور لاکھوں حدیثوں کے ذخیروں میں سے انتخاب کر کے چار ہزار روایات کو مختلف ابواب کے تحت پوری مناسبت کے ساتھ اپنی کتاب "سنن ابن ماجہ" میں درج فرمایا۔ عمر بھر علم حدیث کے درس و تدریس کا مشغلہ رہا۔ بلند پایہ محدثین میں آپ کا شمار ہے۔

۲۰۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اور ۲۱ رمضان ۲۷۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ محمد بن علی قہرمان اور ابراہیم بن دینار وراق دو بزرگوں نے آپ کو غسل دیا۔ اور آپ کے بھائی ابوبکر نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اور آپ کے دونوں برادران ابوبکر و

عبداللہ اور آپ کے فرزند عبیداللہ نے آپ کو قبر میں اُتارا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ
(تاریخ ابن ماجہ وغیرہ)

امام دارمی

ان کی کنیت ابو محمد اور نام و نسب عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی ہے۔ سمرقند کے علماء میں سے نہایت ہی بلند پایہ حافظِ حدیث ہیں۔ امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ابوحاتم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ اپنے زمانے کے امام تھے۔ قبیلۂ بنی تمیم میں ایک خاندان دارم بن مالک بن منظلہ کی طرف نسبت ہونے کی وجہ سے "دارمی" کہلاتے ہیں۔ ۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔ چوہتر برس کی عمر شریف ہوئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ (اکمال)

امام بیہقی

ابوبکر احمد بن حسین بیہقی شعبان ۳۸۴ھ میں نیشاپور سے تیس کوس دور "بیہق" نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اس لیے "بیہقی" کہلاتے ہیں۔ زہد و تقویٰ اور دیانت و عبادت میں علمائے ربانیین کی تمام خصائل حمیدہ کے جامع تھے، امام حاکم کے بلند مرتبہ شاگردوں میں سے ہیں۔ فن حدیث و فقہ اور تصانیف میں یکتائے روزگار ہوئے ہیں۔ مشہور فقیہ وقت محمد بن عبدالعزیز مروزی کا بیان ہے کہ ایک روز میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک صندوق زمین سے آسمان کی طرف اُڑا جا رہا ہے۔ اور اس کے ارد گرد نور چمک رہا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ تو فرشتوں نے جواب دیا کہ یہ امام بیہقی کی تصنیفات کا صندوق ہے۔ جو بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو گیا ہے آپ کی کل تصنیفات کا اندازہ بڑے سائز کے سولہ ہزار صفحات کے قریب ہے۔ جمادی الاولیٰ ۴۵۸ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ لوگ ان کو تابوت میں رکھ کر "بیہق" گاؤں میں لائے۔ اور مقام خسروجرد میں دفن کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (بستان المحدثین و اکمال)

امام خطّابی

ان کی کنیت ابوسلیمان اور نام و نسب احمد بن محمد خطابی ہے۔ اپنے دور کے "علامۃ العصر" اور یکتائے دہر تھے۔ فقہ و حدیث اور ادب وغیرہ میں بہت ہی باکمال اور فخر روزگار تھے۔ ان کی تصنیفات بھی بہت ہی مشہور

اور عجیب ہیں۔ معالم السنن، اعلام السنن، غریب الحدیث آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔ آپ شارح الحدیث بھی ہیں۔ ۳۸۸ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ (الکمال)

امام بغوی ابو محمد حسین بن مسعود بغوی فقیہ شافعی کا شمار فقہ و حدیث کے اماموں میں ہے بہت ہی متقی و پرہیزگار اور صحیح العقیدہ دیندار عالم دین تھے۔ کتاب المصابیح، شرح السنۃ حدیث میں کتاب التہذیب فقہ میں، اور معالم التنزیل تفسیر میں آپ کی مشہور تصنیفات ہیں۔ خراسان کے ایک شہر "بغشور" یا شہر "بغ" کی طرف نسبت کی وجہ سے بغوی کہلاتے ہیں۔ ۵۱۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (رحمۃ اللہ تعالیٰ) (الکمال)

امام نووی آپ کی کنیت ابوزکریا اور نام و نسبت محی الدین یحیٰ بن شرف نووی ہے۔ اپنے دور کے امام اور بہت بڑے عالم و فاضل، انتہائی متقی و پرہیزگار فقیہ و محدث تھے۔ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ فقہ میں ان کی کتاب الروضہ، حدیث میں الریاض اور الاذکار، شروحِ حدیث شرح مسلم، وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ آپ دمشق کے ایک گاؤں "نویٰ" کے رہنے والے تھے۔ ۶۵۰ھ میں جب کہ آپ کی عمر انیس برس کی تھی اپنے گاؤں سے دمشق شہر آئے۔ اور علوم حاصل کر کے فقہ و حدیث میں فضل و کمال حاصل کیا۔ آپ بہت بڑے حق گو، انتہائی قناعت پسند، اور سادہ زندگی بسر کرنے والے تھے۔ بہت زیادہ شب بیدار، اور دن رات علمی مشاغل اور اعمال صالحہ میں مصروف رہتے تھے۔ رجب ۶۷۶ھ میں وفات پائی۔ آپ کی قبر شریف نووی گاؤں میں مسلمانوں کی زیارت گاہ ہے۔ پینتالیس برس کی عمر پائی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ (الکمال)

نوٹ: اس قسم کے دو سو محدثین و فقہاءِ امت کے مفصل حالات ان کی علمی و عملی خدمات اور عبادات و کرامات کا تذکرہ ہماری کتاب "اولیائے رجال الحدیث" میں پڑھیے۔ اس کتاب کو مدارسِ عربیہ کے طلبہ و مدرسین، واعظین اور عامۃ المسلمین سبھی نہایت ہی والہانہ عقیدت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

دُعا

اے خداوندِ جہاں، اے کردگار
سارے عالم کا تُو ہے پروردگار
شکر تیرا کس طرح سے ہو ادا
نعمتیں یارب ہیں تیری بے شمار
خالق و مالک تُو سب کا بالیقین
سب ہیں تیرے بندۂ خدمت گزار
سب کا تُو معبُود، سب عابد ترے
تیرے در کے سب گدائے خاکسار
نیکیوں سے ہاتھ خالی ہیں مِرے
تیری رحمت کا ہُوں میں اُمیدوار
بخش دے یارب گناہوں کو مِرے
تُو ہے غفّار، اور میں عصیاں شعار
ہے ترے دربار میں یہ اِلتجا!
گو نہیں دُنیا میں میرا کچھ وقار
وعدہ فرمایا ترے محبُوب نے
دو جہاں میں ہیں جو میرے غمگسار

میری اُمت کو "مری چالیس بات"
جو بھی پہنچائے گا بن کر دیندار
حشر یوں فرمائے گا اُس کا خُدا
وہ بنا ہو گا فقیہِ نام دار
اور میں ہو جاؤں گا اُس کا شفیع
اور گواہی دوں گا اُس کی شاندار
یہ بشارت سُن کے اے ربِّ کریم
نخلِ دل میں آگئی میرے بہار
اس لیے "چالیس اقوالِ رسولؐ"
چاہتا ہوں لکھ کے یارب بار بار

فضل سے اپنے عطا کر اے خُدا
اعظمی کو بھی یہ رُتبہ، یہ وقار

قطعاتِ تاریخ

ایں رسالہ چو تحریر کرد اعظمیؔ گفت ہاتف کہ "احسنت" صد مرحبا
گر کسے سالِ تصنیف پُرسد بگو گشت تاریخِ او، باغ فردوس ما

۱۳۹۴ھ

دیگر

لکھ رہا ہوں حدیثِ رسولِ خُدا میری تحریر میں خلدِ انوار ہے
ہے تصوّرِ حبیبِ خُدا کا مجھے سامنے میرے طیبہ کا دربار ہے
مصطفٰے کے یہ چالیس اقوال ہیں ان پہ قربان جنّت کا گلزار ہے
جمع چالیس ایسی حدیثیں ہوئیں حشر میں جن سے بیڑا مرا پار ہے
مومنوں کے لیے "باغ فردوس" ہے کُفر کے واسطے حق کی تلوار ہے

یہ جواہر حدیثوں کے ہیں اعظمیؔ !
ان کی تاریخ اقوالِ مُختار ہے !

۱۳۹۴ھ

تاریخ افتتاحِ تصنیف
۲۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۴ھ

تاریخ اختتامِ تصنیف
۲۷ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ